آبِ حیات
کا
تنقیدی مطالعہ

از

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ ایم۔ اے
صدر شعبۂ فارسی و اُردو، لکھنؤ یونیورسٹی

کتاب نگر
دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۳ء

بار اوّل ۱۰۰۰ قیمت ۸/

مضمونوں کی فہرست

ماخذوں کی فہرست

اس رسالے میں جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں ان کے نام ضروری تفصیلوں کے ساتھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :-

۱- مقدمہ فیض میر- از سید مسعود حسن رضوی
نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۹ء
۲- لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم حصہ اوّل
از گریرسن-
۳- گلزار عشق- دیباچہ از محمد باقر آگاہ-
۴- داستان تاریخ اردو- از حامد حسن قادری
آگرہ برقی پریس- آگرہ ۱۹۴۱ء -
۵- تذکرۂ شعرا- از قدرت اللہ قدرت-
۶- مقامات مظہری- از شاہ عبد اللہ معروف بہ
غلام علی- مطبع مجتبائی دہلی- ۱۸۹۲ء -

۷۔ معمولات مظہری۔ از شاہ نعیم اللہ مطبع نظامی کانپور۔ ۱۳۷۵ھ۔

۸۔ عقد ثریا۔ از شیخ مصحفی۔ جامعہ برقی پریس دہلی۔ ۱۹۳۴ء۔

۹۔ تذکرۂ ہندی۔ از شیخ مصحفی جامعہ برقی پریس دہلی۔ ۱۹۳۳ء۔

۱۰۔ گلشن بے خار۔ از مصطفٰے خاں شیفتہ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۴ء۔

۱۱۔ گلشنِ ہند۔ از مرزا علی لطف۔ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور۔ ۱۹۰۶ء۔

۱۲۔ طبقات شعرائے ہند۔ از مولوی کریم الدین ۱۸۴۷ء

۱۳۔ خوش معرکۂ زیبا۔ از سعادت خاں ناصر قلمی کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ۔

۱۴۔ ذکر میر۔ از میر تقی میر انجمن اردو پریس اورنگ آباد (دکن) ۱۹۲۸ء۔

۱۵۔ مقدمہ ذکر میر۔ از مولوی عبد الحق۔

۱۶۔ نکات الشعرا از میر تقی میر نظامی پریس۔ بدایوں
۱۷۔ مقدمہ نکات الشعرا۔ از مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی
۱۸۔ مجموعہ نغز۔ از حکیم قدرت اللہ قاسم کریمی پریس
لاہور۔ سنہ ۱۹۳۳ء۔
۱۹۔ دیباچہ مجموعۂ نغز۔ از محمود خاں شیرانی
۲۰۔ دستور الفصاحت۔ از احد علی یکتا۔ ہندوستانی پریس
رام پور۔ سنہ ۱۹۴۳ء۔
۲۱۔ دیباچہ دستور الفصاحت۔ از مولوی امتیاز علی عرشی۔
۲۲۔ تذکرہ شعرا۔ از میر حسن انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڈھ سنہ ۱۹۲۲ء
۲۳۔ سروِ آزاد۔ از غلام علی آزاد بلگرامی مطبع رفاہِ عام
لاہور سنہ ۱۹۱۳ء۔
۲۴۔ انشا۔ از فرحت اللہ بیگ۔ جید برقی پریس دہلی سنہ ۱۹۴۳ء
۲۵۔ بہترین غزل گو۔ از قاضی غلام امیر امیر بدایونی
الناظر پریس۔ لکھنؤ۔
۲۶۔ ذوق سے ناانصافی۔ از پنڈت جوش ملسیانی آجکل دہلی
۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء۔

۲۷- دیباچہ دیوان ذوق - از آزاد دہلوی. مطبع احمدی دہلی. سنہ ۱۳۷۹ھ۔

۲۸- نیرنگ خیال حصہ اول - از پروفیسر آزاد دہلوی کریمی پریس. لاہور سنہ ۱۹۲۲ء۔

۲۹- کلیات حسرت موہانی - انتظامی پریس حیدرآباد (دکن) سنہ ۱۹۴۳ء

۳۰- دیباچہ دیوان فارسی - از مرزا مظہر دہلوی قلمی و مطبوعہ مطبع کاشی رام لاہور۔

۳۱- تاریخ نظم و نثر اردو - از آغا محمد باقر طبع دوم برانچ کوآپریٹو کیپٹل پریس لاہور، سنہ ۱۹۳۸ء

۳۲- مدراس میں اردو - از نصیر الدین ہاشمی. مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد (دکن) سنہ ۱۹۳۸ء۔

۳۳- الناظر لکھنؤ - جنوری سنہ ۱۹۲۶ء۔

---

۳۴ - سفینۂ ہندی - از رائے بھگوان داس ہندی - قلمی - کتب خانہ مشرقی پٹنہ

آزاد ایک کامل ادیب

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد عربی و فارسی کے جید عالم تھے، سنسکرت اور بھاشا سے بھی واقف تھے، انگریزی شاعری کے رنگ اور انگریزی نثاری کے اسلوب کو خوب سمجھتے تھے. لسانیات کے ذوق پر اُن کی تصنیف سخندانِ فارس شاہد ہے اور ادبی تحقیق کے ذوق پر آبِ حیات گواہ ہے. اس طرح ان میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو اُردو کے کسی ادیب کی کامیابی کے ضامن ہو سکتے ہیں. انھوں نے اُردو کے شعر و ادب کا جائزہ لے کر ہمیں بتایا کہ اس میں کیا کیا خامیاں ہیں اور کن کن چیزوں کی کمی ہے، اور خود ساری عمر ان خامیوں کو دور اور ان کمیوں کو پورا کرنے میں مصروف رہے.

آبحیات کی مقبولیت

بہت سی کتابیں حضرت آزاد کی تصنیف سے ہیں، مگر جن کتابوں نے اپنے مصنف

کا نام اور اُردو ادب کا مرتبہ بلند کر دیا وہ چار ہیں :۔ آب حیات، سخندانِ فارس، دربار اکبری، نیرنگِ خیال۔ یہ گویا چار ستون ہیں کہ حضرت آزاد کی شہرت کا قصرِ رفیع انھیں پر قائم ہے۔ ان میں بھی جو شہرت آب حیات کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری کتاب کو میسر نہیں۔ اُردو شاعروں کے بیسیوں تذکرے موجود ہیں۔ اُن کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں شعر و ادب کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ لیکن اُردو کی ادبی کتابوں میں جتنے حوالے آب حیات کے ملتے ہیں۔ اُن کے نصف بھی شاید کسی دوسری کتاب کے نہیں ملتے۔ اُردو زبان یا اُردو شاعری کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق جب کوئی کچھ لکھنا چاہتا ہے تو اُس کے لیے آب حیات کا مطالعہ ناگزیر ٹھہرتا ہے۔

تذکروں کی خامیاں اُردو شعرا کے بہت سے تذکرے آب حیات سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ مگر سب سے پہلے اسی کتاب نے اُن کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی آزاد آب حیات کے دیباچے میں اِن تذکروں کے متعلق لکھتے ہیں :۔

> اُن سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے، نہ اُس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال

> کھلتا ہے، نہ اُس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے معاصروں میں اور اُس کے کلام میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سالِ ولادت اور سالِ فوت تک بھی نہیں کھلتا[1]۔"

زیادہ تر تذکروں میں شاعروں کے حالات بے حد مختصر ہیں اور اُن میں صرف اتنی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے کہ شاعروں کے تخلصوں کے ابتدائی حرفوں کا اعتبار کر کے حروف تہجی کے تحت میں ترتیب وار جمع کر دیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے کل شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے، یعنی متقدمین، متوسطین اور متاخرین اور ہر طبقے کے شعرا کو پھر اُسی طرح حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

آبحیات بے نظیر تذکرہ

آب حیات اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے، جس میں مصنف نے اُردو کی کل شاعری پر نظر کر کے اُس کو کئی عہدوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر عہد کی زبان اور شاعری کے خصوصیات بیان کرنے کے بعد اُس عہد کے نامی شاعروں کا حال اس تفصیل اور اس خوبی سے لکھا ہے کہ اُن کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویریں کتاب پڑھنے والوں کے سامنے

---

[1] آبحیات ص۲۷

آجاتی ہیں اور ساتھ ہی وہ زمانہ اور وہ ماحول بھی نظروں میں پھر جاتا ہے، جس میں اُن کی شاعری نے نشو و نما پائی تھی۔ آب حیات کی یہی وہ حیرت انگیز خصوصیت ہے، جس میں کوئی کتاب اس کی شریک نہیں۔

پُرانے شاعروں کو نئی زندگی

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اُردو کے قدیم شعرا کے متعلق ہم کو جو واقفیت ہے اور ان سے ہم کو جو دلی تعلق ہے، وہ آب حیات ہی کے طفیل میں ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی، تو نہ میرؔ سے ہم کو یہ عقیدت ہوتی نہ سوداؔ کی ہماری نظر میں یہ وقعت ہوتی۔ میرؔ اور سوداؔ کے دیوان تو خیر چھپے ہوئے موجود ہیں، اس لئے ممکن تھا کہ کبھی کوئی صحیح المذاق اپنے ذاتی مطالعے کی بنا پر ان کمالوں کے مرتبۂ شاعری کا کسی قدر اندازہ کر لیتا۔ مگر حاتمؔ، مظہرؔ، قائمؔ، جرأتؔ، رنگینؔ ضاحکؔ اور اسی طرح کے بہت سے شاعروں کا تو شاید کوئی نام بھی نہ لیتا۔ اب جو انکا نام ہر اُردو داں کی زبان پر ہے، تو یہ آب حیات ہی کی بدولت ہے۔ حضرت آزادؔ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ:-

”سوداؔ اور میرؔ وغیرہ بزرگان سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے، وہ آج کل کے لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ سبب

پوچھے، تو جواب فقط یہی ہے کہ جس طرح اُن کے کلاموں
کو اُن کے حالات اور وقتوں کے واردات نے خلعت اور
لباس بن کر ہمارے سامنے جلوہ دیا ہے، اُس سے اربابِ زمانہ
کے دیدہ و دل بے خبر ہیں اور حق پوچھو تو انھیں اوصاف
سے سودا سودا اور میر تقی میر صاحب ہیں۔[۵]

آب حیات نے اُردو کے قدیم شاعروں سے عام دلچسپی پیدا کر کے
لوگوں میں ادبی تحقیق کا شوق اور اُردو شعر و ادب کی تاریخ لکھنے کا
خیال پیدا کر دیا اور شاعروں کے حالات کے ساتھ اُن کے زمانے
اور ماحول کی تصویر کشی کی ضرورت محسوس کروا دی۔

آبحیات کے مقلّد آب حیات نے تذکرہ نویسی کی بھی ایک
نئی راہ نکال دی۔ صفیر بلگرامی کا تذکرہ
جلوۂ خضر اور حکیم عبدالحئی کا تذکرہ گلِ رعنا دیکھئے۔ دونوں پر آب حیات
کا پرتو صاف نظر آئے گا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کے تذکرے
آب بقا کا تو نام ہی بتا رہا ہے کہ اُس پر آب حیات کا کتنا اثر ہے۔

آبحیات کے اوّلیات (۱) اُردو زبان کی تاریخ آب حیات نے
پہلے پہل پیش کی اور ہم کو لسانی تحقیق

---
[۵] آبحیات ص ۳۰

کا راستہ دکھایا۔ اگرچہ آب حیات کے بعد کئی کتابوں میں اس مضمون سے بحث کی گئی، لیکن آب حیات کا طرزِ بحث اب بھی بعض حیثیتوں سے بے نظیر ہے۔

(۲) اُردو زبان نے فارسی انشا پردازی سے جو فائدے اُٹھائے، اُن کا اعتراف کرتے ہوئے اُن نقصانات کی طرف آب حیات ہی نے ہمیں سب سے پہلے توجہ دلائی، جو فارسی کی رنگین اور تخیلی انشا پردازی کی تقلید سے اُردو کو پہنچے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو نثر جو استعارے اور مبالغے کی کثرت سے بوجھل ہو رہی تھی، اس میں سادگی اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کرنا بہت کچھ آب حیات کا کام ہے۔ اس کتاب نے ایک طرف فارسی کی پُر تکلف انشا پردازی کا بھاشا کے سادہ، فطری اور پُر زور اندازِ بیان سے مقابلہ کر کے اُردو نثر کی اصلاح کی ضرورت سمجھائی اور دوسری طرف ان دونوں کو سمو کر انشا پردازی کا ایک نیا اور بے نظیر طرز پیش کر دیا۔ یہ اصولی اور عملی تعلیم بہت مفید ثابت ہوئی۔ لوگوں نے آب حیات کے بنائے ہوئے اُصول کو پیش نظر رکھا اور آب حیات کے اسلوب بیان کو اپنے لیے نمونہ بنایا۔ اُردو کے بہت سے نثاروں کے یہاں آب حیات کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

(۳) اُردو نثر کی طرح اُردو شاعری کی اصلاح میں بھی آب حیات کا بھی کچھ حصہ ہے۔ اُردو شاعری، خاص کر اُردو غزل، کے نقائص کی طرف سب سے پہلے آزاد ہی نے توجّہ دلائی۔ آب حیات کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہ اظہار قابل افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ یعنی مضامین عاشقانہ، میخواری مستانہ، بے گل و گلزار وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصل موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری، اسی میں فلک کی جفا کاری۔ اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصل ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں، تو وہی خیال استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔"[۵]

اس سلسلہ میں ایک اقتباس اور پیش کیا جاتا ہے:۔

"اُردو دانوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا۔ لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے۔ وہی

مقرّری باتیں ہیں، کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں، کہیں ادل بدل کرتے ہیں، اور کہے جاتے ہیں۔ گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں انھیں کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزا رہا۔ حسن و عشق، سبحان اللہ! بہت خوب! لیکن تابہ کے؟ حور ہو یا پری، گلے کا ہار ہو جائے، تو اجیرن ہو جاتی ہے[۵]۔"

کچھ دنوں سے اُردو غزل گوئی کے خلاف جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں، وہ آزاد کے انھیں بیانوں کی صدائے بازگشت ہیں۔

(۴) اسی طرح اُردو کے ادیبوں میں سب سے پہلے آزاد ہی نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ شاعری کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ بلکہ اس سے سماجی اور سیاسی نظام کی اصلاح یا تبدیلی کا کام بھی لینا چاہیے۔ وؔلی کے کلام کی مقبولیت اور اُس کی تقلید میں اُردو شاعری کے رواج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہرِ انسانیت پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا

---

[۵] آبحیات صفحہ ۹۳

اور اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستے سے نہیں
آیا، بلکہ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آگیا تھا۔ کاش
شاہنامے کے ڈھنگ سے آتا، کہ محمد شاہی عیاشی اور عیش
پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو پھر تیموری اور بابری
میدانوں میں لا ڈالتا، یا تہذیب و شائستگی سے اکبری عہد
کو پھر زندہ کر دیتا۔"[۱۵]

(۵) آب حیات ایک طرف اُردو شاعری کے ارتقا کی تاریخ پیش کرتی ہے، تو دوسری طرف ہماری سوسائٹی، بالخصوص اُس کے علمی و ادبی پہلو، کا ایسا مکمل نقشہ دکھاتی ہے، جس کی نظیر کوئی دوسری تصنیف پیش نہیں کر سکتی۔ حضرت آزاد جس وقت اُردو زبان اور شاعری کے مختلف ارتقائی دوروں پر نظر کر رہے تھے، اور ہر دور کے ممتاز شعرا کے حالات لکھ رہے تھے، اُس وقت جو سماں اُن کے پیش نظر تھا، اُس کا بیان انھیں کی زبان سے سنئے:

اس زبان کے رنگ میں اُن کی رفتار، گفتار، اوضاع، اطوار
بلکہ اُس زمانے کے چال چلن پیش نظر تھے، جس میں اُنھوں نے
زندگی بسر کی اور کیا سبب ہوئے کہ اس طرح بسر کی۔ اُن کے

---

۱۵ آبحیات صہ ۹۳-۹۲

جلسوں کے ماجرے اور حریفوں کے وہ معرکے جہاں طبیعتوں نے تکلف کے پردے اٹھا کر اپنے اصلی جوہر دکھا دئے، اُن کے دلوں کی آزادیاں، وقتوں کی مجبوریاں، مزاجوں کی شوخیاں، طبیعتوں کی تیزیاں، کہیں گرمیاں، کہیں نرمیاں کچھ خوش مزاجیاں، کچھ بے دماغیاں، غرض یہ سب باتیں میری آنکھوں میں اس طرح عبرت کا سرمہ دیتی تھیں، گویا وہی زمانہ اور وہی اہل زمانہ موجود ہیں[۵]۔"

حضرت آزاد نے اس سماں کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دی ہے کہ وہی زمانہ اور وہی اہلِ زمانہ ہماری نگاہوں کے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ہم جس عہد کا حال پڑھتے ہیں، اُس عہد میں پہنچ جاتے ہیں اُس کے مشاعروں اور دوسری ادبی صحبتوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اُس عہد کے ممتاز شاعروں کو چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دیکھتے ہیں، اُن کی زبان سمجھتے ہیں۔ اُن سے باتیں کرتے ہیں، اُن کا مزاج پہچان لیتے ہیں اُن کی خوشی اور غم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ تصویر کشی اور انشاپردازی کا یہ کمال اُردو کے کسی اور مصنف کو بھی نصیب ہوا ہے؟ مرزا فرحت اللہ بیگ کے دو تین مضمون یعنی ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

۵؎ آبحیات صلا

مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، ۱۲۶۱ھ کا ایک مشاعرہ، اسی طرز کے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ مرزا صاحب نے یہ طرز آب حیات ہی سے سیکھا ہو۔

آبحیات کی بروقت تصنیف آب حیات جس زمانے میں لکھی گئی، وہ اس نوعیت کی کتاب کی تالیف کا آخری موقع تھا۔ حضرت آزاد نے اس حقیقت کو سمجھ کر اُس موقع سے ایسا فائدہ اُٹھایا، جو انھیں کا سا جامع صفات مصنف اُٹھا سکتا تھا۔ اگر وہ موقع نکل جاتا، تو پھر ایسی کتاب کبھی وجود میں نہ آسکتی۔ اس سلسلہ میں خود حضرت آزاد فرماتے ہیں:۔

"چونکہ میں نے، بلکہ میری زبان نے، ایسے ہی اشخاص کی خدمتوں میں پرورش پائی تھی، اس لیے ان خیالات میں دل کی شگفتگی کا ایک عالم تھا، جس کی کیفیت کو کسی بیان کی طاقت اور قلم کی زبان ادا نہیں کر سکتی۔ لیکن ساتھ ہی افسوس آیا کہ جن جوہریوں کے ذریعے سے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے، وہ تو خاک میں مل گئے۔ جو لوگ باقی ہیں، وہ بجھے چراغوں کی طرح ایسے ویرانوں میں پڑے ہیں کہ اُن کے روشن کرنے کی یا اُن سے روشنی

لینے کی کسی کو پروا نہیں۔ پس یہ باتیں، کہ حقیقت میں اثبات
ان کے جوہر کمالات کے ہیں، اگر اسی طرح زبانوں کے حوالے رہیں،
تو چند روز میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ اور حقیقت میں
یہ حالات نہ مٹیں گے، بلکہ بزرگانِ موصوف دنیا میں فقط نام
کے شاعر رہ جائیں گے، جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہوگا، جو ہمارے
بعد آنے والوں کے دلوں پر یقین کا اثر پیدا کر سکے۔ ہر چند
کلام اُن کے کمال کی یادگار موجود ہیں، مگر فقط دیوان جو
بکتے پھرتے ہیں، بغیر اُن کے تفصیلی حالات کے اس مقصود کا
حق پورا پورا نہیں ادا کر سکتے۔ نہ اُس زمانے کے عالم اس
زمانے میں دکھا سکتے ہیں۔ اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا“[۱]

حضرت آزاد نے یہ کتاب لکھ کر ہماری معاشرتی اور ادبی تاریخ
کے نہایت اہم پہلوؤں کو ابدی گمنامی سے بچا لیا۔ ہم ان کے اس
ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

آزاد کے کوتاہ نظر نکتہ چیں

میر تقی میر کے رسالے فیض میر کا مقدمہ جو راقم الحروف نے لکھا ہے
اس کی کچھ عبارت جو آبِ حیات سے متعلق ہے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

---

[۱] آبحیات ص ۲-۳

"حضرت آزاد نے آب حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے، جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا اور اُن کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے، کہ اُن کے اکثر بیانوں کا من گڑھت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ ظرفی نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے، جس نے آزاد پر جا بے جا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن دور بیں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ یہ حالت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہیں ہے۔ ادبی تحقیق کا ذوق اب ہمارے دلوں میں گھر کر رہا ہے، اور اپنے ادبی دفینوں کی تلاش میں خاک چھاننے کی دھن پیدا ہو چلی ہے۔ یہ ذوق ذرا اور پختہ اور یہ دھن کچھ اور پکّی ہولے اور تحقیق کے راستے کی مصیبتوں اور خطروں کا احساس عام طور پر ہونے لگے، تو یہ عارضی آزاد بیزاری بے شبہہ آزاد پرستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت بھی ادبی تحقیق میں آزاد ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہے، کہ اُن سے اختلاف کرنا محقق ہونے کی سند سمجھا جاتا ہے۔ آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی اور پھیلائی جا رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آب حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا، جو ہماری دسترس

سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے، اُس کو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں، لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں، اُن کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ انشا پردازی کا یہ کمال اگر کسی اور کے حصے میں نہ آیا ہو تو آزاد سے نہیں فطرت سے لڑنا چاہیے۔"[1]

آب حیات کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کا بعض طبیعتوں پر عجیب اثر پڑا۔ وہ آب حیات میں غلطیاں نکالنے اور کتاب کو غیر مستند ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں بہت سے بے بنیاد اعتراض کیے گئے، جنھوں نے اعتراض کرنے والوں کی ناواقفیت اور کوتاہ نظری کی قلعی کھول دی، مگر کچھ مفید کام بھی ہوگیا۔

آزاد کی تنقیص کے ذمہ دار

ہم نے ابھی کہا ہے کہ کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں ہے۔ حضرت آزاد کے یہاں بھی غلطیاں ہیں، مگر وہ غلطیاں بھی ایسی ہیں جیسی ایک محقق ہی سے

---

[1] مقدمۂ فیض میر ص ۲۰۱

ہو سکتی ہیں اور جن کی بنا تحقیق ہی پر ہے۔ تحقیق میں غلطی ہو جانا اور چیز ہے اور بلا تحقیق کچھ لکھ مارنا اور چیز ہے۔ ان ناگزیر غلطیوں کی بنا پر کسی کتاب کو کلیتہً پایۂ اعتبار سے ساقط کر دینا اور اُس کے مصنف کی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں پر پانی پھیر دینا بے دردی بھی ہے اور جہالت بھی۔ بعض ذی علم اور نام بر آوردہ بزرگوں کی غیر تحقیقی تحریروں اور غیر محتاط رایوں سے متاثر ہو کر ایسے ایسے نوخیز لکھنے والے، جو علمی استعداد اور معلومات کی وسعت کے اعتبار سے آزاد کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچتے، اس محقق علام کے منہ آنے لگے اور اُس پر اعتراض کر کر کے گویا چاند پر خاک ڈالنے لگے۔ اِن سب اعتراضوں کا جائزہ لیا جائے، تو آب حیات سے زیادہ ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ اس لیے آیئے مثال کے طور پر چند اعتراضوں کو لیں اور دیکھیں کہ آزاد کے جن بیانوں سے وہ متعلق ہیں، وہ تحقیق پر مبنی ہیں یا نہیں۔

ولی اردو کا پہلا شاعر

آزاد نے ولی دکنی کو ایک جگہ "نظم اردو کی نسل کا آدم" اور ایک جگہ "بنی نوع شعرا کا آدم" کہا ہے۔ یعنی اُن کو اُردو کا پہلا شاعر مانا ہے اور سب شاعروں کو اُن کی اولاد معنوی قرار دیا ہے معترض

کہتے ہیں کہ ولی سے پہلے دکن میں بہت سے اردو کے شاعر گزر چکے تھے۔ آزاد ان سے واقف نہ تھے۔ اس لیے یہ غلط نظریہ قائم کرلیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے دکھنی اور ریختہ یا اردو کا فرق نظر میں رکھ کر ولی کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیا ہے، دکنی کا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ولی ہی کے اثر سے اردو شاعروں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ لسانیات کا مشہور عالم اور ہندوستان کی زبانوں کا زبردست ماہر "ڈاکٹر گریرسن" بھی ولی کو "بابائے ریختہ" اور شمالی ہند کے اردو شاعروں کو اس کا مقلد کہتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:[۵]

"It was in the Deccan that Hindostani, under the form of Urdu, first received cultivation, and it was at the hands of Wali of Aurangabad, *the father of Rekhta*, that a standard of literary form was given to it. Wali's example was followed at Delhi, and from thence the poetical literature of Urdu spread over Northern India."

محمد باقر آگاہ دکن کے ایک متبحر عالم، زبردست مصنف اور نامور شاعر میر اور سودا کے ہم عصر تھے۔ ان کی مثنوی گلزار عشق جو سنہ ۱۲۱۱ھ

---

۵ Linguistic Survey of India, Vol. IX, Pt. I.

کی تصنیف ہے۔ اُس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوداؔ کو "قصائد و غزل میں بڑا سخن تراش و صاحب تلاش" سمجھتے تھے۔ اور "محاورۂ شستہ و صاف میں یگانۂ زمانہ" مانتے تھے۔ مگر نصرتیؔ دکنی کو قصیدے اور مثنوی میں نہ صرف سوداؔ سے بہتر بلکہ اساتذۂ ایران کا ہمسر سمجھتے تھے۔ وہ دکھنی اور اُردو دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا دعویٰ ہے:-

ہے دکھنی میں مجھ کو مہارت نبی ۔۔۔ کہ النصر منکم کہے نصرتیؔ
گر اُردو کے بھاکا میں کھولوں زباں ۔۔۔ تو سوداؔ کا سب سود ہووے زیاں

آگاہؔ اپنی اس مثنوی کی زبان کے متعلق کہتے ہیں کہ "میں نے "زبان قدیم دکنی" کو چھوڑ کر "محاورۂ صاف و شستہ کو کہ قریب روزمرۂ اُردو کے ہے اختیار کیا۔" اس دیباچے کا ایک ٹکڑا غیر ضروری فقرے حذف کر کے یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

"اکثر جاہلان بے معنی۔۔۔۔۔ زبان دکھنی پر اعتراض۔۔۔۔ کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی، زبان اُن کی درمیان اُن کے خوب رائج اور طعن و شماتت سے سالم تھی، اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطیؔ و فراقیؔ، شوقیؔ، خوشنودؔ، عواصیؔ، ذوقیؔ، ہاشمیؔ

شغلی، بحری، نصرتی، مہتاب وغیرہم کے بے حساب ہیں۔
اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و مثنویات و مقطعات نظم
کیے اور داد سخنوری کا دیے ..... جب شاہان ہند اس
گلزار جنت نظیر کو تسخیر کیے طرز و روزمرہ دکھنی نہج محاورہ
ہندی سے تبدیلی پانے لگے ...... ہندوستان میں مدت
لگ زبان ہندی کہ اُسے برج بھاشا بولتے ہیں رواج
رکھتی تھی ...... پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و
فارسی بتدریج داخل ہونے لگے ...... سبب سے اس
آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی ہوئی ...... ولی گجراتی
غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مقتدا اور اُستاد ہے۔
بعد اُس کے جو سخن سنجان ہند پیرو ہو کیے، بے شبہ اس
نہج کو اسی سے لیے اور من بعد اس کو یہ اسلوب خاص
مخصوص کر دیے اور اُسے اُردو کے بھاکے سے موسوم
کیے۔ اب یہ محاورۂ معتبر شہروں میں ہند کے جیسا شاہ
جہاں آباد، لکھنؤ، و اکبرآباد وغیرہ رواج پایا اور جوں
چاہیے سبھوں کے من بھایا۔"[۵۱]

یہی آگاہ اپنے چند اخلاقی اور مذہبی منظوم رسالوں کی زبان

کے متعلق لکھتے ہیں :-

"اُن سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں۔ بلکہ صاف اور
سادہ کہا ہوں۔ اور اُردو کے بھاکے میں نیں کہا ہوں۔
کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے۔ اُس بھاکے سے واقف
نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں"۔[1]

قدرت اللہ قدرتؔ اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتے ہیں کہ جب ولیؔ دہلی آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن کو اپنی غزلیں سنائیں تو شاہ صاحب نے یہ مشورہ دیا۔

"شما زبان دکنی را گذاشتہ موافق اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد
موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج و قبولِ خاطر
صاحب طبعانِ عالی مزاج گردد"۔

آگاہؔ خود دکنی تھے اور دکنی اور اُردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ولیؔ سے پہلے کے دکنی شاعروں سے خوب واقف اور اُن کے کارناموں کے بڑے قدر شناس تھے۔ اس کے باوجود ولیؔ کو ریختہ یعنی اُردو غزل کا موجد اور اس صنفِ سخن میں سب کا مقتدا اور اُستاد مانتے ہیں اور کل اُردو غزل کہنے والوں کو اُس کا مقلد سمجھتے

---

[1] داستان تاریخ اُردو صـ۹

ہیں۔ آزاد کی تحقیق کی صحت اور رائے کی اصابت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

میرزا مظہر کی حسن پسندی آزاد نے مظہر کے حال میں لکھا ہے:-

"وہ خود بیان کرتے تھے کہ حسن صورت اور لطف معنیٰ کا عشق ابتدا سے میرے دل میں تھا۔ چھوٹے سن میں بھی مصرع موزوں زبان سے نکلتے تھے۔ شیر خوارگی کے عالم میں حسن کی طرف اس قدر میلان تھا کہ بدصورت کی گود میں نہ جاتا تھا۔ کوئی خوبصورت لیتا تھا تو ہمک کر جا پڑتا تھا اور پھر اس سے لیتے تو بمشکل آتا تھا۔"[۵۱]

مرزا مظہر کے ایک شاگرد میر عبد الحئی تاباں جو حسن میں یوسف ثانی تھے ان کے حال میں لکھا ہے:-

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور ان کی صحبت میں کہ جہاں کبھی وعظ وارشاد اور کبھی نظم واشعار کا جلسہ رہتا تھا، تاباں بھی حاضر ہیں اور باادب اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ حضرت اگرچہ محفل ارشاد کے آداب

---

۵۱ آبحیات ص ۱۳۵

سے گرم جوشی ظاہر نہ کرتے تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ انھیں دیکھتے ہیں اور مارے خوشی کے باغ باغ ہوئے جاتے ہیں۔"[1]

مذہبی تعصب کے مریضوں کو ان بیانوں میں آزاد کے تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مرزا مظہر ایک صوفی بزرگ تھے، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ تصوف کے مسلک میں عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ خود مرزا مظہر کے والد میرزا جان بیٹے سے فرماتے تھے :-

"ہر کہ دلش بداغ عشق برشتہ نمی شود و خاشاک طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد، زمین طینت او صلاحیت تخم محبت الٰہی ندارد، زیرا کہ عشق مجازی زینۂ عشق حقیقی است۔ پس مادامے کہ رشتۂ عشق مجازی طوق گلو کردہ (خود را) در کوچہ و بازار رسوا و خوار نہ سازید روح فقیر از شما راضی نخواہد شد۔"[2]

میرزا جان کی اس نصیحت اور وصیت کی بنا پر مرزا مظہر کا فرض تھا کہ باپ کی روح کو خوش کرنے کے لئے عشق مجازی کا طوق گلے میں ڈالکر خود کو کوچہ و بازار میں رسوا اور خوار کریں۔ خود اُن کا بھی یہ عقیدہ تھا

---

[1] آبحیات ص۱۳۹-۱۴۰ [2] معمولات مظہری ص۱۱

"کہ عشق مجازی برائے گرمی دلہائے افسردہ آتش الٰہی است[1]۔"
شیر خوارگی کے زمانے میں مرزا مظہر کی حسن پسندی کے بارے میں آزاد نے وہی کہا ہے جو مرزا صاحب کے خلیفہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی نے اپنی کتاب معمولات مظہری میں لکھا ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

"از حالت صبا و شیر خوارگی انوار عشق ..... از جبین مبین ایشاں ظاہر و ہویدا بود ..... و در کنار خوب روئے برغبت تمام می رفتند و از کنار او جدا نمی شدند مگر بہ حیلہ، و از سن شعور مصرع موزوں می نمودند۔ ازیں جاست کہ می نمودند کہ شاعری و پریشاں نظری از خمیر طینت نقیر است[2]۔"

مرزا مظہر کے ایک دوسرے خلیفہ شاہ عبد اللہ معروف بہ شاہ غلام علی نے اپنے مرشد کی سوانح عمری مقاماتِ مظہری میں اُن کی حسن پسندی کو انھیں کی زبانی ذرا تفصیل سے یوں بیان کیا ہے:-

"می فرمودند شور عشق و محبت خمیر مایۂ طینت من است و خاطر را از آغاز صبا میل تمام بہ مظاہر جمیلہ ثابت۔ مرا یاد است کہ

---

[1] مقامات مظہری ص۱۷ [2] معمولات مظہری ص۶

طفل شش ماہہ در آغوش مرضعہ بودم، زنے جمیلہ مرا در کنار
گرفت، جلوۂ جمالش دل مرا از جا برد و خاطر را بہ او دا بستگی
پیدا شد۔ دلم بے دیدار او قرار نمی گرفت۔ در فراقش گریہ ہا
می کردم۔ پنج سالہ بودم کہ آوازۂ عاشقی من بر زبانہا
افتاد و در مردم مشہور گشت کہ ایں پسر مزاج عاشقانہ
می دارد[۱]"

مرزا مظہر اور میر عبدالحی تاباںؔ کے تعلقات کے بارے میں آزادؔ نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے کہیں زیادہ صفائی کے ساتھ خود مرزا صاحب نے اپنے مشاہدوں اور منظورِ نظر جوانوں کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبداللہ لکھتے ہیں:-

"می فرمودند کہ جاذبۂ محبت من آں قدر رسا بود کہ عوارض
جسمانی شاہدان بر طبیعت من ظاہر می شد۔ یک بار جوانے
کہ منظورِ نظرم بود تپ کرد، مرا نیز تپ عارض شد۔ وے دوا
خورد و اثر دوا در من پدید آمد[۲]"

اب مرزا مظہر کی عاشق مزاجی اور تاباںؔ سے مفرط محبت کے بارے میں آزادؔ کے پیش رو تذکرہ نگاروں کے کچھ قول پیش کیے جاتے ہیں:-

---

[۱] مقامات مظہری ص ۱۶ [۲] مقامات مظہری ص ۱۶

شیخ مصحفی

"در ابتدائے شعور عشق در طینتش مضمر بود"[۵۱]

"چوں در آں روزہا با میر عبدالحی تاباں دوستی بہ شدت داشت..... غزلیات متعددہ از خامۂ فکرش بر صفحہ کاغذ ریختہ بودند کہ مشارٌ الیہ ما لنخ آمدہ"[۵۲]

مصطفیٰ خاں شیفتہ

(احوال مظہر) "ہنگامۂ عاشقی گرم داشت. شورش در سرو بہ رعنا جوانان نظرش بود"[۵۳]

(احوال تاباں) "میرزا مظہر را از دل گرمی شوقش تنور سینہ زبانہ زن"[۵۴]

مرزا علی لطف

"حسن پرستی و دل بستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے اور عشق حقیقی و مجازی سے کام"[۵۵]

منشی عبدالکریم

"وہ حسین آدمی کو بہت چاہتا تھا"[۵۶]

---

۵۱ عقد ثریا ص۵۵ ۵۲ تذکرہ ہندی ص۲۰۳ ۵۳ گلشن بیخار ص۱۸۲
۵۴ گلشن بیخار ص۳۸ ۵۵ گلشن ہند ص۲۱۶ ۵۶ طبقات شعرائے ہند ص۱۰۵

"مرزا خوب صورتوں سے بہت رغبت اور محبت رکھتا تھا۔"[1]

سعادت خاں ناصر

"میر عبدالحی تاباں کی محبت میں زار و نزار تھا۔"[2]

حقیقت یہ ہے کہ تصوف کے مسلک میں حسن پرستی اور عاشق مزاجی عیب نہیں ہنر ہے۔ اگر عیب ہوتی تو مرزا صاحب اپنے مریدوں سے اُس کا ذکر کیوں کرتے اور اُن کے وہ مرید خاص جنھوں نے ارشاد وہدایت کی مسند پر مرزا صاحب کی جگہ لی، اُن کے ان قولوں کو کتابوں میں درج کر کے خاص و عام کے علم میں کیوں لاتے۔

آزاد نے مرزا مظہر کا ذکر جس احترام کے ساتھ کیا ہے اُس سے سوءِ ظن کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مگر بدبینی اور بدگمانی کا کیا علاج۔

میر کے والد کا نام

آزاد نے میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ معترض کہتے ہیں کہ یہ آزاد کی گڑھنت ہے کیونکہ میر نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری ذکر میر میں اپنے والد کا نام میر علی متقی بتایا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ کسی محقق کے لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ زیر تحقیق موضوع کے متعلق جو ماخذ اُس وقت موجود اور اُس کی دسترس

[1] طبقات شعرائے ہند ۱۸۵ [2] خوش معرکۂ زیبا قلمی، احوال میرزا مظہر۔

کے اندر ہوں اُن سے کام لے۔ ذکر میر حضرت آزاد کی نظر سے نہیں گذری تھی اور ان کو اور ان کے بعد ایک مدت تک کسی کو بھی اس کتاب کے وجود کا علم نہ تھا۔ انھوں نے میر کے تصانیف کے سلسلہ میں ذکر میر کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ البتہ آب حیات سے پہلے تین تذکرے ایسے موجود تھے جن میں میر کے والد کا نام دیا ہوا تھا۔ یعنی ناصر کا تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، نساخ کا تذکرہ سخن شعرا اور محسن کا تذکرہ سراپا سخن۔ یہ تینوں تذکرے اس پر متفق تھے کہ میر کے والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ اس نام کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ بھی اُس وقت موجود نہ تھی۔ ان حالات میں کوئی بڑے سے بڑا محقق بھی اس نام کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں لکھ سکتا تھا۔ اب اگر نئے ماخذوں کے ہاتھ آجانے کے بعد یہ نام غلط ثابت ہو جائے تو بھی آزاد کی تحقیق پر حرف نہیں آسکتا۔

اب اس دعوے کی حقیقت بھی سنئے کہ میر نے ذکر میر میں اپنے والد کا نام میر علی متقی بتایا ہے۔ بابائے اردو جناب مولوی عبدالحق صاحب نے یہ دعویٰ بڑی بلند آہنگی سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"آب حیات میں نیز گلزار ابراہیمی میں میر صاحب کے والد

کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ میر صاحب اس کتاب (یعنی ذکر میر) میں ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں...... ساری کتاب میں کہیں اس کا اشارہ تک نہیں کہ سوائے اس کے ان کا کوئی اور نام بھی تھا[1]"

اس کے بعد مولوی صاحب نے کتاب کے وہ مقامات پیش کیے ہیں جہاں میر کے والد کا نام علی متقی بتایا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں لکھا ہے :۔

"باپ کے مرنے کے بعد جب پہلی بار دہلی گئے اور خواجہ محمد باسط نے انھیں نواب صمصام الدولہ امیر الامرا کے ہاں پیش کیا اور امیر الامرا نے دریافت کیا کہ یہ کس کا لڑکا ہے تو وہاں بھی یہی نام بتایا[2]"

(مقدمہ ذکر میر ص د)

اس بحث کے سلسلے میں مولوی صاحب نے میر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے جو اُن کے والد سے متعلق ہے۔

"جوان صالح عاشق پیشہ بود، دل گرمے داشت، بخطاب علی متقی امتیاز یافت"

---

[1] مقدمہ ذکر میر ص د [2] مقدمہ ذکر میر ص د

اور لکھا ہے :-

"اُس جملے میں خطاب کے لفظ سے کچھ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ
شاید اصلی نام کچھ اور ہو۔"[۱]

پھر اس شبہہ کو اس دلیل سے رد کر دیا ہے :-

"اُن کے والد کا نام کتاب میں بارہا آیا ہے۔ میر صاحب کی
زبان سے ہو یا کسی دوسرے کی زبان سے لیکن ہر جگہ
علی متقی ہی لکھا ہے۔ اس سے وثوق ہوتا ہے کہ اصلی نام
یہی تھا۔"[۲]

راقم عرض کرتا ہے کہ وہ شبہہ صحیح تھا، یہ دلیل غلط ہے۔ اور اس
غلط خیال پر مبنی ہے کہ امیر الامرا کے دریافت کرنے پر خواجہ
باسط نے بھی میرؔ کے والد کا نام علی متقی بتایا تھا۔ ذکر میر کا جو نسخہ
خود مولوی صاحب نے مرتب کیا ہے اُس میں امیر الامرا کا سوال اور خواجہ
باسط کا جواب ان لفظوں میں ملتا ہے :-

"پرسید کہ ایں پسر از کیست، گفت از میر محمد علی است۔"[۳]

۱؎ مقدمہ ذکر میر صـ ۷ ۲؎ مقدمہ ذکر میر صـ ۸

۳؎ ذکر میر صـ ۶۲ -

اس جواب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ میر کے والد کا نام میر محمد علی اور خطاب علی متقی تھا۔

مولوی شروانی مرحوم کے اعتراضات

میر کا تذکرہ نکات الشعرا انجمن ترقی اردو نے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی مرحوم کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس مقدمے میں جگہ جگہ مولانا کے ایسے اقوال ملتے ہیں، جن میں آزاد کی غلط بیانیاں کنایتہً یا صراحتہً دکھائی گئی ہیں۔ ذیل میں وہ عبارتیں نقل کر کے اُن پر تحقیق کی روشنی ڈالی جائے گی :-

مولوی شروانی کے قول :-

"نکات الشعرا کو غور سے پڑھنے کے بعد پورا یقین ہو جاتا ہے کہ میر صاحب نہایت پاک مشرب، مودب و مہذب، زندہ دل، یار باش اور منکسر المزاج انسان تھے۔"[1]

"تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میر صاحب کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے اُن کی خود بینی و خود پسندی یا بد دماغی

---

[1] مقدمہ نکات الشعرا صـ۳-۴

اور تعلّی عیاں ہو۔"[۱]

میر کی نازک مزاجی اور بے دماغی

میر کے جو اخلاقی اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ سب تسلیم، لیکن اُن کی منکسر مزاجی تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ میر کی سیرت کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت اپنی نگاہ کو صرف نکات الشعرا میں محدود رکھنا اور میر کا دفتر دفتر کلام، اُن کی خود نوشتہ سوانح عمری اور اُن کے ہمعصروں کے بیانوں کو نظر انداز کر دینا کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچا سکتا۔ میر صاحب کو خود اعتراف ہے کہ

"ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ"

وہ خود فرماتے ہیں :-

سر کسی سے فرو نہیں آتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

ہر لحظہ بد مزاجی رہتی ہے میر تم کو الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

انھوں نے ذکر میر میں ایسے کئی واقعے لکھے ہیں، جن سے اُن کی نازک مزاجی اور بے دماغی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کتاب کے مقدمے میں ایک جگہ اُن واقعات کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے[۲]

---

[۱] مقدمہ نکات الشعرا صٹ [۲] مقدمہ ذکر میر صلا - ک

حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی میر کے ہم عصر تھے۔ اُنھوں نے اپنا تذکرہ مجموعۂ نغز میر کی زندگی میں لکھا تھا۔ وہ میر کے غرور و نخوت کا ذکر بہت پُرزور لفظوں میں یوں کرتے ہیں :-

"از کبر و غرورش چہ برطرازم کہ حدے نہ دارد و از نخوت و خود سریش چہ برنگارم کہ سینۂ قلم حقائق رقم می فگارد"[1]

قاسم نے میر کی بد دماغی کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے یہاں مشاعرہ تھا۔ جرأت نے کئی غزلیں پڑھیں۔ تحسین و آفریں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میر بھی موجود تھے۔ جرأت میر کے قریب آئے اور اپنے کلام کی داد چاہی۔ میر خاموش رہے۔ آخر دو تین مرتبہ کی درخواست کے بعد یہ "الفاظ ہندی" اُن کی 'زبان نخوت توامان' پر جاری ہوئے :-

"کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹا (کذا) کہہ لیا کرو۔"[2]

آزاد نے بھی یہ واقعہ قاسم کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

---

[1] مجموعۂ نغز جلد دوم ص ۲۳۰ [2] مجموعۂ نغز جلد اول ص ۱۵۶-۱۵۵۔

لیکن میر کے قول میں چوما چاٹا کی جگہ چوما چاٹی لکھا ہے[1]
اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

احد علی خاں یکتا لکھنوی میر کے ہم عصر تھے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب دستور الفصاحت میر کے انتقال سے بارہ تیرہ سال پہلے لکھی اور اُن کے انتقال کے تین چار سال بعد اُن کے حالات پر نظر ثانی کی۔ وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں :۔

"جناب میر بہ غیر در کمال استغنائے تصوف، کہ مضمر بخاطرش بودہ اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحال مردم می نمود۔ بلکہ گاہ گاہ با امراہم چنانکہ باید راہِ التفات و مبالغت نمی پیمود۔"[2]

میر کی نازک مزاجی کا ایک واقعہ اُن کی زبان سے بھی سن لیجئے۔ ایک دن میر اپنا ایک نیا طولانی قصیدہ نواب آصف الدولہ کو سنا رہے تھے۔ ایرانی شاعر ملا محمد بھی موجود تھے۔ اور نواب کی مدح میں کچھ پڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن میر کا قصیدہ سارا وقت لیے لے رہا تھا۔ آخر تنگ آکر بولے میر صاحب آپ کا قصیدہ خوب ہے، مگر طولانی ہے۔ اگر نواب صاحب کا دماغ وفا نہ کرتا تو کون سنتا۔ یہ

---

[1] آبحیات صـ ۲۴۱ [2] دستور الفصاحت صـ ۲۵۔

سنتے ہی میرؔ نے بیاض پھینک دی اور منغض ہو کر کہا اگر نواب کا دماغ وفا نہ کرتا تو میرا دماغ کب وفا کرتا۔ انھوں نے ذرا بھی نواب کا پاس نہ کیا۔ مگر نواب نے نہایت مہربانی اور منتوں سے اُن کو منایا اور پورا قصیدہ سنا۔[۱]

شیخ مصحفیؔ بھی میرؔ سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے اور اُن کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے اور انتہائی توقیر و تعظیم کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے تذکرے عقد ثریا میں میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"از بسکہ از ابنائے زمانہ کسے را مخاطب صحیح نمی پندارد سخن بہ ہر کس و ناکس نمی کند۔ ازیں جہت اعزہ اور ا کج خلق و برخود غلط و انصاف دشمن قرار می دہند"[۲]

انھیں مصحفیؔ نے اپنے تذکرہ ہندی میں میرؔ کے بیٹے فیض علی فیضؔ کے متعلق یہ جملہ لکھا ہے "از کے حصہ از عجب پدر ہم دارد"[۳]

میر حسن میرؔ کے شاعرانہ کمال کے بے حد معترف ہیں مگر اس حقیقت کے اظہار پر مجبور رہیں کہ "بسیار صاحبِ دماغ است"[۴]

۱؎ دستور الفصاحت ص ۲۵-۲۶ ۲؎ عقد ثریا ص ۵۴

۳؎ تذکرہ ہندی ص ۱۵۹ ۔ ۴؎ تذکرہ میر حسن ص ۱۷۵

آزاد نے میر کی نازک مزاجی اور بے دماغی کے چند واقعات بیان کیے ہیں، جن کو صحیح ماننے میں بعض لوگوں کو تامل ہے۔ مگر سعادت خاں ناصر لکھنوی، جو میر سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے تذکرے "خوش معرکۂ زیبا" میں ایسے ایسے واقعات لکھے ہیں، جن کے سامنے آزاد کے بیان کیے ہوئے واقعات کی کوئی حقیقت نہیں یہ تذکرہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس لیے وہ واقعات یہاں مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔

"ایک مرتبہ میر صاحب اور شاہ قدرت اللہ کشتی پر بیٹھے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنے دیوان سے چند غزلیں سنائیں۔ میر صاحب کچھ نہ بولے۔ شاہ صاحب نے عرض کیا، آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ میر صاحب نے جواب دیا، بہتر یہ ہے کہ تم اپنا دیوان اسی دریا میں ڈال دو۔

• •

عماد الملک نواب غازی الدین خاں دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے مرغابیوں، بطوں اور سرخابوں کا تماشا دیکھ رہے تھے! اتفاق سے میر صاحب بھی آگئے۔ نواب صاحب نے اپنے چند قصیدے پڑھ کر داد چاہی۔ میر صاحب نے فرمایا، میری تعریف کی کیا

ضرورت ہے۔ آپ کے اشعار سے ہر بطر پر وجد و سماع کی

حالت طاری ہے۔

• •

نواب عماد الملک نے میر صاحب کو طلب کیا۔ صرف ایک کرسی

رکھی گئی جس پر وہ خود بیٹھے۔ مقصد یہ تھا کہ میر صاحب کھڑے

رہیں۔ انھوں نے ایک لمحہ انتظار کیا۔ اس کے بعد اپنا دوپٹہ

دُہرا کر کے بچھایا اور اس پر بیٹھ گئے۔ نواب نے میرؔ سے

کچھ پڑھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے یہ قطعہ پڑھ کر سنا دیا:

کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بےخبر — میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

• •

لکھنؤ کے سفر میں گاڑی پر ایک بنیے کا ساتھ ہو گیا۔ روانگی

کے وقت کچھ رات باقی تھی جب روز روشن ہوا اور اُس کی

صورت دیکھی تو اپنا منہ پھیر لیا اور راستہ بھر اُس کی طرف

اپنا منہ نہ کیا۔

• •

میرؔ صاحب لکھنؤ میں تازہ وارد تھے کہ مرزا مغل سبقت

جو خود اچھے شاعر تھے، ان کی ملاقات کو گئے۔ اور کچھ دیر
اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد درخواست کی کہ اپنے
کلام سے مستفید فرمائیے۔ میر صاحب نے بے تامّل فرمایا،
تمھاری صورت سے سخن فہمی ظاہر نہیں ہوتی پھر اپنے سخن کو
ضائع کرنے سے کیا حاصل۔

• •

ایک دن نواب آصف الدولہ بہادر اپنے کتب خانے میں
تشریف فرما تھے۔ سامنے میر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک
کتاب نواب صاحب سے دور اور میر صاحب سے قریب تھی۔
نواب صاحب نے فرمایا کہ وہ کتاب مجھ کو اُٹھا دیجیے۔ میر صاحب
نے ایک خادم سے فرمایا سنو تمھارے آقا کیا فرماتے ہیں
نواب صاحب نے اُٹھ کر وہ کتاب خود اُٹھا لی۔

• •

آصف الدولہ نے کہا کیوں میر صاحب مرزا رفیع سودا کیسا
مسلم الثبوت شاعر تھا۔ میر صاحب نے جواب دیا۔ بجا ارشاد
ہوا۔ ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است،

آصف الدولہ کے استاد میر سوز مجرے کے لیے حاضر ہوئے میر صاحب بھی اس وقت موجود تھے۔ نواب کی فرمائش پر سوز نے دو تین غزلیں پڑھیں اور نواب نے خوب تعریف کی۔ میر صاحب کو سوز کی جسارت اور نواب کی تعریف بہت ناگوار گزری اور سوز سے کہا، تمھیں اس دلیری پر شرم نہیں آتی۔ تمھاری شعر خوانی کا موقع اور محل تو وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈکلیاں پک رہی ہوں، نہ وہ جہاں میر تقی موجود ہوں یہ کہہ کر وہ شقہ، جو نواب نے میر کی طلب کے لیے لکھا تھا جیب سے نکال کر نواب کے سامنے رکھ دیا اور خانہ آباد دولت زیادہ، کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(خوش معرکۂ زیبا، ورق ۴۲ الف تا ۴۳ ب)

میر سے ذاتی واقفیت رکھنے والے مصنفوں کے یہ بیانات میر کی ویسی ہی تصویر پیش کرتے ہیں جیسی آزاد نے آب حیات میں کھینچی ہے۔ ان بیانات کو پڑھنے کے بعد میر کو منکسر المزاج ماننا مشکل ہے۔

مولوی شروانی کا قول:۔

میر اور خان آرزو	میر صاحب خان آرزو کو اپنا استاد بلکہ

پیر و مرشد بتاتے ہیں۔ آزاد کہتے ہیں "بگڑ کر الگ ہو گئے"[1]

مولوی عبدالحق صاحب نے ذکر میر کے مقدمے میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :۔

"اس کتاب (یعنی نکات الشعرا) میں میر صاحب نے خان آرزو کا بڑے ادب سے ذکر کیا ہے اور اُن کے کمال اور سخن فہمی کی بے حد تعریف کی ہے۔ اور مرزا معز (فطرت موسوی خاں) کے حال میں انہیں" استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آزاد کا یہ قول نہایت ناگوار گزرتا ہے کہ "خاں صاحب حنفی مذہب تھے، میر صاحب شیعہ۔ اُس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے"۔ قیاس یہی ہوا کہ یہ بھی آزاد کا ایک چٹکلا ہے، جو حسب عادت لطف داستان اور رنگینی بیان کی خاطر لکھ گئے ہیں لیکن جب یہ کتاب (ذکر میر) ہماری نظر سے گزری تو معلوم ہوا کہ آزاد بڑی پتے کی بات لکھ گئے ہیں۔ میر صاحب خان آرزو کے دل آزار برتاؤ اور بے مروّتی کے نہایت شاکی ہیں[2]" صد

---

[1] مقدمہ نکات الشعرا صـ ۲۲ ۔

اس کے بعد میر کے ان بیانوں میں جو تضاد ہے اُس کی ایک قیاسی توجیہ پیش کی ہے جو محلِ نظر ہے۔ مولوی امتیاز علی عرشی کی واقعاتی توجیہ اس سے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

میر صاحب نے "شعبان ۱۱۶۵ھ میں ۔۔۔۔ خان آرزو کی ہمسایگی چھوڑ دی ہے۔ اس لیے بعید نہیں کہ اس تاریخ سے قبل ہی تذکرہ ختم کر چکے ہوں، ورنہ تذکرے میں اُنھیں اُستاد و پیر و مرشد بندہ کے لفظوں سے یاد نہ کرتے"۔[۱]

کچھ آگے بڑھ کر پھر لکھتے ہیں:۔

آرزو کے متعلق انھوں (یعنی میر) نے جو عمدہ تعریفی کلمات استعمال کیے ہیں وہ شعبان ۱۱۶۵ھ کے قبل کے لکھے ہوئے ہیں، جب کہ وہ آرزو کے یہاں یا اُن کے پڑوس میں رہا کرتے تھے۔"[۲]

میر کے ذکر میں حکیم قاسم کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی میر اور خان آرزو کی باہمی کشیدگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

"نسبت تلمذ ہم بہ ۔۔۔۔۔ خان مشارٌ الیہ (یعنی خان آرزو) دارد اما بنا بر نخوتے کہ در سرش جا گرفتہ ازیں امر ۔۔۔

۱و۲ دیباچہ دستور الفصاحت ص۲۶۔

..... را یاء کلی بہ میاں آرد[۱]۔"

مولوی شروانی کا قول:۔

میر کا داد دینے میں بخل میر صاحب نے نکات الشعرا میں اپنے سامنے کے لڑکوں کے کلام کی خوبی بھی تسلیم کی ہے........ آزاد کا بیان مانا جائے تو وہ سعدی و حافظ کی غزل پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے[۲]۔"

آزاد کا یہ بیان حکیم قاسم کی عینی شہادت پر مبنی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"بر شعر کسے، اگرچہ ہمہ اعجاز باشد، و کلام شیخ شیراز باشد، سر ہم نمی جنباند، تا بہ تحسین خود چہ رسد و بہ سخن احدے، اگرچہ معجز طراز ی بود، و گفتۂ اہل شیرازی، گوش ہم فرانمی دارد۔ امکان چیست کہ حرفِ آفریں بر زبانش رود[۳]۔"

میر صاحب کی نخوت یا حد سے گزری ہوئی خودداری کے واقعات جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں، وہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ وہ شعر کی داد دینے میں رو رعایت سے بالکل کام نہ لیتے تھے۔

۱؎ مجموعۂ نغز جلد دوم ص ۲۲۹-۲۳۰ ۲؎ مقدمہ نکات الشعرا ص ۲۲
۳؎ مجموعۂ نغز جلد دوم ص ۲۳

مولوی شروانی کا قول :-

ولی اور شیطان

ولی کی نسبت میر صاحب نے یہ ریمارک کیا ہے "از کمال شہرت احتیاج تعریف نہ دارد" شیطان والا فقرہ سارے تذکرے میں کہیں نہیں[1]"

آزاد نے میر کے تذکرۂ شعرا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے، اُس کے حق میں فرماتے ہیں۔" وے شاعریست از شیطان مشہور تر"[2] حکیم قاسم بھی اس جملے کو میر کا قول بتاتے ہیں۔ وہ میر کے حال میں لکھتے ہیں :-

"در حق شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر۔ وسزائے ایں کردار ناہنجار از کمترین شاعر بہ واجبی یافتہ، کہ ہجو ہائے متعددہ او کردہ، کہ بعضے ازآں بغایت رکیک و پردہ در افتادہ[3]"

اور کمترین کے حال میں اس بیان کی تکرار کرتے ہیں :-

---

[1] مقدمہ نکات الشعرا صـ۲۳ [2] مجموعۂ نغز جلد دوم صـ۲۳
[3] مجموعۂ نغز جلد دوم صـ۲۹۷۔

"بنا بر نوشتن میر در تذکرۂ خود شاعرشان جبل التخلص بہ
ولی راکہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر، ہجوہائے
رکیکہ بہ راجی نمودہ[51]"

پھر ولی کے حال میں میر کے اس قول کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔
"حقش بر جملہ سخن پردازانِ ہندی زبان ثابت است
وسخن بر سخش ابلیس منشی وشیطنت۔ میر خاں کمترین کہ
خداش بیامرزد، بسیار بموقع وبجا گفتہ کرد ولی پر جو
سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں[52]"

بہر حال میر کے جس جملے کو قاسم نے دو جگہ نقل کیا اور تیسری جگہ
اُس کی طرف اشارہ کیا، اور جس کی بنا پر کمترین نے میر کی نہایت
رکیک ہجویں کہیں۔ وہ نکات الشعرا کے مطبوعہ نسخے میں موجود
نہیں ہے۔ اُس کی جگہ یہ جملہ ملتا ہے "از کمال شہرت احتیاج تعریف
نہ دارد[53]" اس معمے کا حل آگے ملے گا۔

مولوی شروانی کا قول :۔

میر کی بدگوئی "آزاد نے لکھا ہے کہ ایک ہزار شعرا میں سے

---

[51] آبحیات ص ۲۱۱ [52] مجموعۂ نغز جلد دوم ص ۲۳۰
[53] نکات الشعرا ص ۹۴۔

کوئی بیچارہ میر صاحب کے طعنوں اور ملامتوں سے نہیں
بچا، حالانکہ میر صاحب نے تقریباً سب کو خوبی سے یاد
کیا ہے۔"[۵۱]

اس معاملے میں بھی حکیم قاسم آزاد کے ہم نوا ہیں۔ کہتے ہیں :-
"در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ"[۵۲]

میرزا مظہر کا نام

مولوی شیروانی کا قول :-
"آزاد نے ہر جگہ میرزا مظہر صاحب
رحمتہ اللہ علیہ کا نام جان جاناں لکھا
ہے، حالانکہ میر صاحب نے جان جاناں لکھا ہے جو صحیح
ہے۔ ایک شخص نے جان جاناں شعر میں باندھا تو میر صاحب
نے ٹوکا کہ ایسا خواص کو نہیں چاہیے۔ صحیح نام لکھنا چاہیے"[۵۳]

یہ درست ہے کہ مرزا مظہر کا نام جان جاں رکھا گیا تھا۔ لیکن وہ
اپنی زندگی میں بھی عام طور پر جان جاناں ہی کہلاتے تھے۔ علامہ
غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنا تذکرہ سرو آزاد مرزا مظہر کی زندگی
میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے ان کا نام تو میرزا جان جاں بتایا

---

۵۱ مقدمہ نکات الشعرا صہ ۳۲۔ ۵۲ مجموعہ نغز جلد دوم صہ ۲۳
۵۳ مقدمہ نکات الشعرا صہ ۲۴۔

ہے۔ مگر یہ بھی لکھا ہے کہ "نام او بر السنہ میرزا جان جاناں جاری شدہ"[۱]
میرؔ کے زمانے میں ایک شاعر کا جان جاناں نظم کرنا مولوی شیرانی نے
خود ہی بیان کیا ہے۔ مرزا سوداؔ، سلام اللہ خاں اور مولوی ثناء اللہ
پانی پتی نے مرزا مظہر کی وفات پر جو قطعات تاریخ[۲] کہے ہیں اُن میں
ذیل کے شعر بھی ہیں:۔

تاریخ وفات اُس کی کہی بادرد درد
سوداؔ نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم
(سوداؔ)

جان جاناں کہ جان جاناں بود
در محرم شہید شد بہ جفا
(سلام اللہ خاں)

آن حضرت میرزائے مظہر
جان جاناں حبیب اللہ
(ثناء اللہ)

اِن شعروں میں مرزا مظہر کو جان جاناں کے نام سے یاد کرنے والے
سب کے سب اُن کے ہم عصر تھے۔ اور مولوی ثناء اللہ اُن کے خلیفہ
بھی تھے۔ اُن کے ایک اور خلیفہ شاہ نعیم اللہ نے اُن کا نام
جان جاناں بتانے کے بعد لکھا ہے: "اما بر زبان عوام .... مشہور

۱؎ سروِ آزاد صفحہ ۲۳۱۔ ۲؎ یہ قطعات معمولات مظہری میں درج ہیں۔

و معروف بہ جانِ جاناں ...... اند[51]" اور جہاں کہیں اُن کا نام لیا ہے وہاں 'جان جاناں' ہی لکھا ہے۔ مرزا مظہر کے تیسرے خلیفہ شاہ عبداللہ معروف بہ شاہ غلام علی نے اپنے مرشد کی سوانح عمری لکھی تو اُس میں ہر جگہ اُن کا نام جان جاناں، ہی لکھا ہے[52]۔ تذکرہ نویسوں نے بھی اکثر و بیشتر اُن کا ذکر جان جاناں ہی کے نام سے کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ مرزا مظہر خود بھی اپنا نام جان جاناں لکھتے ہیں مثلاً

"بعد حمد و صلوٰۃ از فقیر جان جاناں مولوی صاحب مہربان سلمہ الرحمٰن مطالعہ فرمائید[53]"

"بعد حمد و صلوٰۃ از فقیر جان جاناں مطالعہ فرمائید[54]"

"بعد حمد و صلوٰۃ فقیر جان جاناں ...... وصیتے چند براحباب ...... می کنم[55]"

ان حالات میں اگر آزاد نے مرزا مظہر کا نام 'جان جاناں' لکھا تو اس سے اُن کی ناواقفیت ثابت نہیں ہوتی۔

آزاد مرزا مظہر کا اصل نام بھی جانتے تھے اور اس کی وجہ

---

[51] معمولات مظہری ص ۶ [52] مقامات مظہری صفحات ۳، ۱۴، ۲۳، ۳۰، ۶۱ وغیرہ [53] و [54] مقامات مظہری ص ۹۳ [55] معمولات مظہری ص ۱۴۴۔

تسمیہ بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عالمگیر کو مرزا کی ولادت کی خبر گزری تو "عالمگیر نے کہا کہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ باپ مرزا جان ہے۔ اس کا نام ہم نے جان جاں رکھا۔"[1] آزاد کا بیان ترجمہ ہے معمولات مظہری کی حسب ذیل عبارت کا:۔

"چوں خبر ولادت باسعادت آں حضرت بہ سمع مبارک عالمگیر رسید فرمود کہ پسر جان پدری باشد۔ چوں نام والدش مرزا جان است نام پسرش را جان جاں مقرر کردم۔"[2]

عجب اتفاق ہے کہ آبحیات اور معمولات مظہری کے نسخے جو میرے پیش نظر ہیں ان دونوں میں جان جاں کی جگہ جان جاناں لکھا ہوا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ کاتبوں کا سہو قلم ہے۔

مولوی شروانی نے جو غلطیاں اور غلط بیانیاں آزاد کی طرف منسوب کی تھیں اُن کا جائزہ تحقیق کی روشنی میں لیا جا چکا۔ نکات الشعرا کے بارے میں آزاد کے بیانات اور

---

[1] آبحیات ص ۱۳۵ [2] معمولات مظہری ص ۶۔

اُس کے مطبوعہ نسخے کے مضامین میں جو اختلاف ملتا ہے،
اُسے دیکھ کر شروانی صاحب فرماتے ہیں :۔

"نکات الشعرا کا جو چہرہ آب حیات میں نظر

آزاد کے قیاسی طوطے مینا

آتا ہے وہ ان خط و خال کے بالکل برعکس ہے جو
اب ہمارے سامنے ہیں[1]"

● ●

"یہ اور اسی قسم کے بہت سے بیان میں آب حیات میں
دیکھتا ہوں تو غرق حیرت ہو جاتا ہوں۔ اور سمجھ
میں نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہے۔ سارے مضمون نکات الشعرا
کے بالکل خلاف اور ضد ہیں[2]"

اور آخر میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں :۔

"نکات الشعرا آزاد کی نظر سے نہیں گزرا۔ قیاس کی
بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں اور
اُن کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے[3]"

---

[1] مقدمہ نکات الشعرا صا
[2] مقدمہ نکات الشعرا ص۲۲
[3] مقدمہ نکات الشعرا ص۲۴

مولوی شروانی نے اعتراف کیا ہے کہ "ابتداءً اس تذکرے کا علم تذکرہ آب حیات کے ذریعہ سے ہوا تھا۔"[1] اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد کو کیا ضرورت تھی کہ نکات الشعرا کو لوگوں کے علم میں لاتے، پھر اپنی تخئیل سے اُس کے مضامین گڑھتے اور اپنے دل سے اُس کی عبارتیں بناتے۔ اور یہ سب فریب کاریاں کس لیے؟ میر کو بدنام کرنے کے لیے۔ آخر میر سے آزاد کو کیا دشمنی تھی؟ میں جب ان سوالوں پر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آزاد کو تو اُن کے علم و فضل، اُن کے کمال انشا پردازی اور اُن کی بے نظیر تصنیفوں کی بدولت اُن کے زمانے نے عزت کی کرسی پر بٹھایا تھا اور اُن کو اپنے نام کی لاج بھی رکھنا تھی، ایسی دیدہ دلیری تو کوئی ادنیٰ درجہ کا مصنف بھی نہیں کر سکتا، اور اس کے ساتھ ہی میر کے ہم عصر قاسم دہلوی کو ہر موقعے پر آزاد کا ہم نوا پاتا ہوں، تو دل کہتا ہے کہ قاسم اور آزاد کے سامنے نکات الشعرا کا مکمل نسخہ اپنی اصل شکل میں تھا۔ امکان تو اس کا بھی ہے کہ ایک ہی

---

[1] مقدمہ نکات الشعرا صا

نسخہ دونوں کی نظر سے گزرا ہو۔ قیاس کہتا ہے کہ جس ذریعے سے قاسم کے ہاتھ کا لکھا ہوا مجموعہ نغز کا اصل مسودہ آزاد تک پہنچا تھا اسی ذریعے سے نکات الشعرا کا وہ نسخہ، جو قاسم کی ملک تھا، آزاد کے ہاتھ لگا ہوگا۔

نکات الشعرا کا مطبوعہ نسخہ اصل نسخے کا ترمیم شدہ خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔ مولوی شروانی کی تحقیق ہے کہ یہ تذکرہ "میر صاحب کے عہدِ شباب کی تالیف ہے، جب کہ وہ دہلی میں تازہ وارد تھے[1]" یہ وہی زمانہ تھا جب میر کے مزاج میں ایسی شورش پیدا ہو گئی تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے تھے سعادت خاں ناصر لکھتے ہیں :۔

> خود فرماتے تھے کہ عنفوان جوانی میں جوشِ وحشت اور استیلائے سودا طبیعت پر غالب ہوا اور کام و زبان ہرزہ گوئی پر راغب۔ ترک ننگ و نام، رسوائی خاص و عام پسند آئی۔ ہر کسی کو دشنام دینا شعار، اور سنگ زنی کاروبار تھا"[2]

---

[1] مقدمہ نکات الشعرا ص۳ [2] خوش معرکہ زیبا ورق ۱۴۱ ب ۱۴۲ الف۔

اُسی زمانے میں میرؔ نے اژدر نامہ لکھ کر اپنے کو اژدہا اور دوسرے شاعروں کو حشرات الارض قرار دیا تھا۔ اُس زمانے میں جو تذکرہ لکھا گیا اُس میں بدزبانی اور تلخ کلامی کیوں نہ ہوگی۔ جب طبیعت کو سکون ہوا تو اُس کا لب و لہجہ بدل کر ایسا کردیا جیسا اب ہے۔

سید انشا کا جنون

آزادؔ نے لکھا ہے کہ سید انشا آخر میں مجنون ہو گئے تھے۔ اس بیان کی صداقت میں بھی شبہہ کیا گیا ہے۔ مرحوم مرزا فرحت اللہ بیگ نے انشا نام کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس بیان کو حقیقت کے خلاف بتایا ہے۔ اور اس سلسلے میں لکھا ہے:۔

"آزادؔ مرحوم نے سیّد انشا کی وہ حالتِ زار بیان کی ہے کہ پڑھ کر کپکپی سی آجاتی ہے۔ لیکن جب ہم خود انشا کے نواسے مرزا اوجؔ کا بیان دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکایت بھی آزادؔ مرحوم کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مرزا اوجؔ بیان کرتے ہیں کہ "نہ تو سیّد انشا مجنون ہوئے اور نہ اُن کی تنخواہ بند

ہوئی۔ صرف یہ ہوا کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم
دے دیا کہ وہ سوائے دربار کے اور کہیں نہ آئیں اور
دربار میں بھی صرف طلبی پر حاضر ہوں[۱]"

مگر انشا کے ہم عصر یکتا لکھنوی کا قول ہے کہ وہ آخر میں مجنون ہو گئے۔ چند سال اسی حالت میں گزرے اور اسی مرض میں انتقال ہوا۔ یکتا کے الفاظ یہ ہیں :۔

"آخر آخر مجنون شدہ چند سال گذشتہ۔ او دند کہ
بہ ہماں مرض در گذشت[۲]"

ایک عینی شاہد کے اس واضح بیان کے سامنے بعد والوں کی قیاس آرائیاں کیا وقعت رکھتی ہیں!

ذوق اور غالب ایک اعتراض عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ آزاد نے ذوق کو غالب پر ترجیح دے کر بڑی ناانصافی کی ہے۔ بے شک آزاد کو ذوق سے بڑی عقیدت اور بہت محبت تھی، جو اُن کی بات بات سے ٹپکتی ہے۔ مگر عقیدت اور محبت کا اظہار اور چیز

---

[۱] انشا صلا [۲] دستور الفصاحت ص۱۰۱۔

ہے اور بے جا پاس داری اور چیز ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آزاد نے ذوق اور غالب کے کلام پر جو رائیں ظاہر کی ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ ذوق کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر اُن کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے"[۱]

سودا کے کمال قصیدہ گوئی کا ذکر کر کے کہتے ہیں :۔

"اُن کے بعد شیخ مرحوم (یعنی ذوق) کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا اور اُنھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا"[۲]

مرزا غالب کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"وہ کیسی طبع خداداد لایا ہوگا جس نے اُس کے فکر میں یہ بلندی، دماغ میں یہ معنی آفرینی

---

[۱] آبحیات صہ ۴۶۹ [۲] آبحیات صہ ۱۷۱ -

خیالات میں ایسا انداز، لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔[1]"

• • •

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اُس سے ہزاروں درجے عالم معنیٰ میں کلام بلند ہے۔[2]"

• • •

"دو باتیں اُن کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی اُن کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔[3]"

غالبؔ کے اردو کلام میں بیشتر اشعار ایسے تھے جن میں

---

[1] آبحیات ص ۵۰۵، [2] آبحیات ص ۵۱۴، [3] آبحیات ص ۵۱۵-۵۱۶

اغلاق وابہام کا عیب تھا۔ اُن کو خارج کر دینے کے بعد اُن کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا گیا۔ اس منتخب مجموعے میں بھی بہت سے شعر ایسے ہیں جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ اور اسی لیے اب تک اس کی دس بارہ شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ آزاد نے کلام غالبؔ کے اس عیب کا ذکر تو کیا ہے، مگر اس میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ رکھا ہے۔ کہتے ہیں:-

"اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"[۵۱]

کون کہہ سکتا ہے کہ ذوقؔ و غالبؔ کے بارے میں آزاد کی یہ رائیں صحیح اور بے لاگ نہیں ہیں؟

آزاد نے بعض حیثیتوں سے ذوقؔ کو نہ صرف غالبؔ پر بلکہ اُردو کے تمام شاعروں پر ترجیح دی ہے۔ مگر اس معاملے میں وہ منفرد نہیں ہیں۔ اُن کے زمانے میں تو اُن کے ہم خیالوں

---

۵۱ آبحیات ص۵۱۴،

کا شمار مشکل تھا، مگر اُن کے بعد بھی ہر زمانے میں ایسے لوگ ملتے ہیں، جو اُن کی رائے کے موئید ہیں۔ جنوری ۱۹۲۶ء کے رسالہ النّاظر میں ایک انعامی مضمون کا اعلان کیا گیا، جس کا موضوع یہ تھا کہ عہد میر تقی میر کے بعد سے اس وقت تک غزل گوئی میں کون شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے قاضی علام امیر صاحب امیر بدایونی نے انعامی مقابلے سے الگ رہ کر ایک طولانی مقالہ لکھا جو بعد کو 'بہترین غزل گو' کے نام سے ایک رسالے کی شکل میں چھپ گیا اُس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"اسی محترم ہستی (یعنی ذوق) نے 'ملک الشعرأ اور 'خاقانی ہند' کے القاب سے دنیائے شاعری میں شہرت پائی، سودا اور میر کے بعد غزل اُردو کو بلند سے بلند درجے پر پہنچا دیا، مشکل سے مشکل مضمون کو اس آسانی سے کہہ دیا کہ دشوار پسند طبیعتیں آج تک حیران ہیں، بندشوں میں صفائی کا رنگ دکھایا، مشکل اور سخت قوافی کو اس خوبی سے اپنی جگہ بٹھایا، کہ تعقید

بھی جو ایسے قوافی کو نظم کرنے میں لاہدی کا ہے،
بھلی معلوم ہونے لگی، ضرب الامثال کو نظم کے
سانچے میں ڈھال کر اپنے کمال کو ثابت کیا،
فارسی ترکیبوں سے بھی نظم اُردو کو زینت دی
عشق و حسن، درد و محبت، تصوف، فلسفۂ قدرت
موت و حیات کے مضامین سے غزل کے چمن کو
سجا کر دنیائے شاعری میں سیر و تفریح کا سامان
مہیا کر دیا۔ اُس عہد کے ارباب سخن نے قدر
و منزلت کی اور آج تک منصف مزاج اعتراف
کرتے ہیں کہ ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق اقلیم
سخن کا مالک اور غزل اُردو کا بادشاہ ہے۔ اُس کے
کلام نے کبھی الفاظ کی مناسب نشست و برخاست
سے سہل ممتنع کا درجہ حاصل کر لیا ہے، کبھی مضامین
کی ندرت سے محال کو ممکن کر دکھایا ہے۔ سودا
اور میر کے بعد یہی وہ زبردست شخصیت ہے،
جس نے نظم اُردو میں کامیابی کا افتخار حاصل

کرکے غزل کی شاعری کو کامیاب بنا دیا ہے۔[۵۱]

قاضی صاحب نے ذوقؔ اور غالبؔ کی اُردو شاعری کا تفصیل کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد آخر میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "ذوقؔ مرحوم میرؔ علیہ الرحمۃ کے بعد اُردو غزل کا سب سے زیادہ کامیاب شاعر تھا۔"[۵۲]

اسی رسالے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "میری رائے میں آزادؔ مرحوم نے حضرت ذوقؔ علیہ الرحمۃ کی بابت جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ذوقؔ کے مرتبہ شاعری سے بہت کم ہے۔"[۵۳] اور اپنی رائے کی تائید میں مولانا حسرتؔ موہانی کا یہ قول پیش کیا ہے۔

"غالبؔ کے ہم عصروں میں اُستاد ذوقؔ سب سے زیادہ محتاط ہیں اور صرف اُردو شاعری کے لحاظ سے ذوقؔ کا درجہ غالبؔ سے..... بلند ہے۔"[۵۴]

مرحوم آمیرؔ بدایونی کا پیشِ نظر مقالہ ۱۹۲۶ء کے اوائل میں شائع ہوا تھا۔ جناب جوشؔ ملسیانی نے ۱۹۴۴ء کے آخری

---

۵۱ بہترین غزل گو ص ۳-۴ ۵۲ بہترین غزل گو ص ۴۴
۵۳ بہترین غزل گو ص ــ ۵۴ بہترین غزل گو ص ۱۶۱

حصے میں ایک مقالہ شائع کیا جس کا عنوان ہے ' ذوق سے ناانصافی[1]'۔

اس مقالے کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:۔

"ذوقؔ کا ایک شعر بھی ایسا نظر نہیں آتا، جس میں غالبؔ کی پیچیدہ بیانی، دبیز فارسیت اور عجیب و غریب ترکیبوں کی لپیٹ میں آئے ہوئے مغلق مضامین موجود ہوں۔ غرابت کا سقم غالبؔ کے کلام میں تو اکثر جگہ نظر آتا ہے مگر ذوقؔ کے کلام میں اُس کا نشان تک نہیں۔"

●

"محاورات زبان کو ایسی خوش اسلوبی سے باندھنا کہ اُس سے بہتر اور کوئی اسلوب بیان خیال میں نہ آسکے، کلام ذوقؔ کی ایسی خصوصیت ہے، جو اسے اُردو زبان کے تمام شعرا میں امتیازی درجہ عطا کرتی ہے...... اس خصوصیت میں اُن کا مدِمقابل

---

[1] رسالہ 'آجکل' دہلی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء۔

کوئی بھی نہیں ہے۔"

•

ذوقؔ کے کئی شعر مثال میں پیش کر کے لکھتے ہیں۔ "روزمرہ زبان اور محاورے کی بندش کا یہ دلکش منظر غالبؔ کے یہاں بہت کم نظر آئے گا۔"

•

"حیرت کا مقام ہے کہ اس امتیازی خصوصیت سے جس نے ذوقؔ کے کلام کو سحرِ حلال بنا دیا ہے، اور جس کی وجہ سے اُس کے صدہا اشعار میں ضرب المثل اور زبان زدِ عام ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، انصاف کی آنکھیں بند کر لی جائیں۔"

•

ذوقؔ کے بہت سے جذباتی اشعار پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"اِن اشعار میں بھی جذبات کی صحیح تصویریں کتنی دلکش ہیں۔ اس قدرتی اندازِ بیان اور حلاوتِ زبان کی ستائش کن الفاظ میں کی جائے۔"

غالبؔ کی عظمت ثابت کرنے کے لئے اگر کلام غالبؔ کے محاسن کافی نہیں ہیں، اور اُن کی فوقیت دوسرے باکمالوں کی تذلیل و تحقیر کی محتاج ہے، تو یہ روش فی الواقع کلامِ غالبؔ ہی کی توہین ہے۔"

•

"افسوس ہے اُردو کے تنگ خیال غالبؔ پرستوں پر کہ اُنھیں حد سے بڑھی ہوئی خوش اعتقادی کے جنون میں دوسروں کے ہنر عیب نظر آتے ہیں۔"

حضرتِ جوشؔ ملسیانی نے کلام غالبؔ کا مطالعہ خوب کیا ہے، یہاں تک کہ اُس کی مکمل شرح بھی لکھی ہے، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ مگر وہ بعض خصوصیتوں کی بنا پر ذوقؔ کو غالبؔ پر، بلکہ تمام شعرائے اُردو پر، ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کا لہجہ بتاتا ہے کہ وہ ذوقؔ کی عظمت کے کس قدر قائل ہیں۔

آغا محمد باقرؔ اپنی تاریخ نظم و نثر اُردو میں ذوقؔ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"نازک خیالی اور معنی آفرینی میں اگرچہ وہ غالبؔ

سے کم ہوں، مگر سادگی، صفائی اور ترنم الفاظ
کے لحاظ سے وہ ان سے بہت آگے ہیں اور قصیدے
میں تو اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"[1]

ان سب چیزوں پر نظر کرنے کے بعد اس اعتراض کی کیا وقعت رہ جاتی ہے کہ آزاد نے ذوق کے ساتھ بے جا طرف داری اور غالب کے ساتھ عمداً ناانصافی کی ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ آزاد نے اپنی کتاب نیرنگ خیال میں جب شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار لگایا اور اُردو شاعروں کو اس میں جگہ دی تو غالب کو کسی سے نیچے نہیں بٹھایا۔[2]

ذوق اور ظفر

آزاد نے ذوق کے حال میں بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے کلام کا بیشتر حصہ ذوق کی فکر کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں کو یہ بات حقیقت سے دور معلوم

---

[1] تاریخ نظم و نثر اُردو ص۱۳۲ [2] "غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔" (نیرنگ خیال حصہ اول ص۱۰۱)۔

ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیال کی تائید میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ذوقؔ اور ظفرؔ کے کلام کا رنگ ایک نہیں ہے۔

ذوقؔ کا دیوان پہلے پہل اُن کے تین شاگردوں ظہیرؔ انورؔ اور حافظ ویرانؔ نے مرتب کرکے ۱۲۷۹ھ میں شائع کیا۔ انورؔ نے اُس کا دیباچہ فارسی میں لکھا۔ اُس میں وہ کہتے ہیں :۔

"چہار دیوان مجلد بادشاہ ...... بتمام وکمال
درست کردہ و چکیدۂ خامۂ فکرش توان گفت۔"[1]

عینی شاہدوں کے بیان کو قیاسی دلیلوں سے جانچنا ہمیشہ صحیح نتیجے تک نہیں پہنچاتا۔ مشاق سخن ور مختلف رنگوں میں غزل کہہ سکتے ہیں اور شاگردوں کی غزلوں پر اُنھیں کے رنگ میں اصلاح دے سکتے ہیں۔ دور کیوں جائیے مولانا حسرتؔ مرحوم کی وہ غزل جس کا مطلع ہے :۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

---

[1] دیباچۂ دیوان ذوقؔ صہ ۱۳

عمداً جراءت کے رنگ میں کہی گئی ہے۔ ایک دوسری غزل جس کا مطلع ہے:-

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

مصحفی کے رنگ میں کہی گئی ہے۔ کلیات حسرت میں پہلی غزل پر "بہ تقلید انداز جراءت" اور دوسری غزل پر "بہ پیروی طرز مصحفی" لکھا ہوا ہے[1]۔ ذوق بھی بڑے مشاق اُستاد تھے۔ مختلف رنگوں میں غزلیں کہہ سکتے اور غزلوں پر اصلاح دے سکتے تھے۔ ظفر کے کلام کی اصلاح کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:-

"نوجوان ولی عہد (ظفر) طبیعت کے بادشاہ تھے۔ اِدھر یہ (ذوق) بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ (ظفر) جراءت کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جراءت اور سید انشا و مصحفی کے مطلعے اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر

---

[1] کلیات حسرت ص ۸۹

آتے رہتے تھے۔ اُن (ظفر) کی غزلیں اُنھیں کے
انداز میں بناتے تھے۔"[۵]

انور کا وہ قول اور آزاد کا یہ بیان، دونوں پر نظر رکھیے تو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

آبحیات کے ماخذ

ہم نے مثال کے طور پر چند اعتراضوں سے جو بحث کی ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آزاد نے کوئی بات بغیر تحقیق کیے ہوئے نہیں لکھی۔ اور جو اعتراض اُن پر کیے گئے ہیں وہ زیادہ تر معترضوں کی بدگمانی، کم علمی اور تنگ نظری کا نتیجہ ہیں۔ للّٰہی بغض کا تو کوئی علاج نہیں، ورنہ اتنی مثالیں آزاد کی تحقیق سے حسن ظن پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایک تذکرہ قاسم کے تذکرے مجموعۂ نغز کے منظرِ عام پر آجانے سے آزاد کے کتنے بیانوں کی تصدیق ہوگئی۔ آب حیات میں اور بھی بہت سی باتیں

---

۵ آبحیات ص۴۸۷۔

ہیں جو اسی تذکرے سے لی گئی ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں اُس کا صرف ایک نسخہ تھا جو مصنف کے قلم کا لکھا ہوا اصل مسودہ ہے۔ اور یہ بھی حضرت آزاد کی ملک تھا، جو اُن کے کتب خانے سے منتقل ہو کر اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے کی زینت ہے۔

حافظ محمود شیرانی مجموعۂ نغز کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"جس مخطوطے پر مطبوعہ متن مبنی ہے۔ وہ مجموعہ کتب مولٰنا محمد حسین آزاد سے تعلق رکھتا ہے، جو اب پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے کی ملک ہے۔ متعدد مقامات پر مولٰنا آزاد نے اُس پر مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نسخۂ ہذا مصنف کا اصل مسودہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسے آثار اور علامات کافی موجود ہیں جو اُس کی کتابت کو مستقلاً مصنف کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں[۱]۔"

---

[۱] دیباچۂ مجموعۂ نغز۔ صفحہ تج

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں :-

"اِس تالیف (مجموعۂ نغز) کی حقیقی وقعت کا اُس وقت اندازہ ہوتا ہے۔ جب مولٰنا محمد حسین آزاد کی مشہور عالم تصنیف آبحیات کی ورق گردانی کی جاتی ہے۔ مولٰنا نے اگرچہ ہر موقع پر اس تالیف سے استفادے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ تاہم وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آبحیات کا ایک بڑا حصہ اس تذکرے سے ماخوذ ہے[1]"

افسوس ہے کہ مولٰنا آزاد کا بیش قیمت کتب خانہ، جو کمیاب کتابوں کا خزانہ تھا، آگ کی نذر ہو گیا۔ یہ آفت نہ پیش آئی ہوتی تو آب حیات کے کل ماخذوں کا پتہ لگ جاتا۔ اور اگر کہیں مجموعۂ نغز کا مسودہ بھی تلف ہو جاتا، تو بدگمان نقادوں کے کتنے بے بنیاد اعتراض حقیقت کے لباس میں جلوہ گر رہتے، اور حقیقت منہ دیکھتی رہتی۔

آزاد کے بیشتر بیانات مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

---

[1] دیباچہ مجموعۂ نغز صفحہ لز

مگر اُنھوں نے معمر اور معتبر بزرگوں سے جو کچھ سنا تھا اُس کو بھی اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ ہمارے ممتاز شعرا کے متعلق جو روائتیں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں، اُن کو محفوظ کر دینا بھی ایک اہم ادبی خدمت تھی۔

آزاد کے زمانے تک یہ دستور نہ تھا کہ جو بات کہی جائے اُس کے لیے سند پیش کی جائے اور ماخذ کا حوالہ دیا جائے۔ اُنھوں نے بھی بہت سی چیزیں نہایت معتبر ماخذوں سے لی ہیں، مگر اکثر مقامات پر اُن کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مثلاً مرزا مظہر کے حال میں لکھا ہے:۔

"سولہ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے۔ اسی وقت سے اپنی مشت خاک کو بزرگوں کے گوشۂ دامن میں باندھ دیا تیس برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جھاڑو دی اور جو دن بہار زندگی کے پھول ہوتے ہیں اُنھیں بزرگوں کے مدفنوں پر چڑھا دیا۔"[1]

یہ بیان مرزا مظہر کے اس قول کا ترجمہ ہے جو اُن کے

---

[1] آبحیات صفحہ ۱۳۸۔

فارسی دیوان کے دیباچے میں موجود ہے مگر آزاد نے اُس کا حوالہ نہیں دیا :-

"در سال شانزدہ از عمر بر روئے این خاکسار غبار یتیمی نشست ...... مشت خاک خود را بداماں درویشان بست و مدت سی سال در مدرسہ و خانقاہ جاروب کش دا ایام گزیدہ عمر در یں شغل شریف گزرانید[1]"

آزاد نے زیادہ تر کتابوں کے حوالے اُن موقعوں پر دیے ہیں، جہاں کہیں مصنف نے عام خیال کے خلاف کوئی بات کہی ہے۔ پھر بھی جن کتابوں کے حوالے آب حیات میں ملتے ہیں اُن کی تعداد کم نہیں ہے۔ ذیل میں اُن کتابوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے :-

(۱) سنسکرت لغت .. .. .. از ہیم چند

(۲) شکنتلا ناٹک .. .. .. از کالی داس

(۳) عہد راجہ بھوج کی ناٹک پستکیں

---

[1] دیباچہ دیوان مظہر

(۴) پرتھوی راج راسا ۔ ۔ ۔ ۔ از چند کوی

(۵) کلام کبیر صاحب

(۶) کلام سور داس

(۷) جپ جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از گرو نانک

(۸) ترجمہ شکنتلا ناٹک ۔ ۔ ۔ ۔ از نواز کوی

(۹) پدماوت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از ملک محمد جائسی

(۱۰) راماین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از تلسی داس

(۱۱) قرآن السعدین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از امیر خسرو

(۱۲) خالق باری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از خسرو

(۱۳) حامد باری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از حامد

(۱۴) تزک جہانگیری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از جہانگیر

(۱۵) نادر نامہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از عبد الکریم

(۱۶) روضتہ الشہدا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از سیوا دکنی

(۱۷) مراثی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(۱۸) نور المعرفت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از ولی دکنی

(۱۹) تذکرہ نکات الشعرا ۔ ۔ ۔ ۔ از میر تقی میر

(۲۰) تذکرہ شعرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از مرزا سودا

(۲۱) تذکرہ فارسی ..... از مصحفی

(۲۲) تذکرہ شعرا ...... از قدرت اللہ قاسم

(۲۳) تذکرہ شعرا ...... از شورش

(۲۴) تذکرہ گلزار ابراہیم ..... از ابراہیم خاں خلیل

(۲۵) تذکرہ گلشن بے خار ..... از مصطفیٰ خاں شیفتہ

(۲۶) تذکرہ سراپا سخن ...... از محسن

(۲۷) تذکرہ شعرا ...... از فائق

(۲۸) تذکرہ دلکشا

(۲۹) دہ مجلس .... از فضلی

(۳۰) نثر شعلۂ عشق ...... از مرزا سودا

(۳۱) ترجمہ قران ...... از شاہ عبدالقادر

(۳۲) رسائل اردو ...... از مولوی اسمٰعیل

(۳۳) خریطۂ جواہر ...... از مرزا مظہر

(۳۴) معمولات مظہری ...... از شاہ نعیم اللہ

(۳۵) تصانیف خواجہ میر درد

(۳۶) دریائے لطافت ...... از انشا

(۳۷) چار شربت ...... از قتیل

(۳۸) قواعدِ اُردو .... از جان گلکرائسٹ

(۳۹) تلخیص معلّٰی .... از نواب کلب حسین خاں نادر

(۴۰) عبرت الغافلین ... از مرزا سوداؔ

(۴۱) مجالس رنگیں ... از رنگینؔ دہلوی

(۴۲) مجموعۂ غزلیات قلمی نوشتہ ۱۱۷۰ھ

(۴۳) مجموعۂ سخن

(۴۴) نوطرز مرصع ... از حسین عطا خاں تحسینؔ

(۴۵) ترجمہ اخلاق محسنی }
(۴۶) باغ و بہار ... } از میر امن

(۴۷) باغ اُردو .... }
(۴۸) آرائشِ محفل ... } از میر شیر علی افسوسؔ

(۴۹) بیتال پچیسی .... از مظہر علی ولاؔ

(۵۰) پریم ساگر..... از للوجی لاؔل

(۵۱) مکاتبات ..... از ابوالفضلؔ

(۵۲) رقعات مرزا قتیلؔ

(۵۳) اُردوئے معلّٰی ... }
(۵۴) عود ہندی ... } از غالبؔ

یہ فہرست سرسری طور پر تیار کی گئی ہے اور اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔ ان کتابوں سے زیادہ تعداد اُن دیوانوں، مثنویوں وغیرہ کی ہے، جن کا آب حیات کی تصنیف کے سلسلے میں مصنف کو گہرا مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ اُن کتابوں میں بعض ایسی ہیں جو اب نایاب ہوگئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو چھپ کر عام ہوگئی ہیں۔ مگر آزاد کے زمانے میں غیر مطبوعہ اور کمیاب تھیں۔

آزاد کے ساتھ بے انصافی

حقیقت یہ ہے کہ جس محنت اور جتنی تحقیق سے آب حیات لکھی گئی ہے اُس کی مثالیں اُردو کے کتابی ذخیرے میں بہت کم ہیں۔ مگر اس کے صلے میں مصنف کو کیا ملا؟ طعن و تشنیع کے نشتر، سب و شتم کے تیر، الزام و اتہام کی برچھیاں! عربی کا مشہور مقولہ مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ، اُردو کے کسی دوسرے مصنف پر اس طرح صادق نہیں آتا جس طرح حضرت آزاد پر۔ جس شخص نے اُردو کی خدمت میں جان کھپا دی، اپنی بے نظیر تصنیفوں سے اُردو کو مالا مال کردیا، اُردو ادب و شعر کی اصلاح و ترقی کے

راستے دکھائے، جس نے آبِ حیات کی سی پر از معلومات اور زندہ جاوید کتاب دی۔ اُس کی ساری محنتوں پر بے دردانہ تنقید اور بے بنیاد الزامات سے پانی پھیر دینا احسان فراموشی کی انتہا ہے۔

آزاد کے بے درد معترضوں میں زیادہ تر جہل مرکب میں گرفتار ہیں، مگر کچھ تعصب کے شکار اور کچھ حسد کے مریض بھی ہیں۔ آزاد کو اپنی زندگی میں ان معترضوں سے جو تکلیف پہنچتی رہتی تھی اُس کا کچھ اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی کتاب دربارِ اکبری میں شیبانی خاں کے حالات کے سلسلے میں اہلِ حسد کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت، بد اصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے۔ . . . یہ نااہل خود کچھ نہیں کرسکتے اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور مورچے باندھتے ہیں۔ . . . خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا، اپنے تئیں خدا کے اور انھیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اُن کے اعمال ہی

اُن سے سمجھ سمجھا لیتے ہیں[۱]"

آبحیات کا اسلوب

اس مختصر رسالے میں آب حیات کی معنوی حیثیت کے متعلق چند باتیں عرض کردی گئی ہیں۔ اُس کی لفظی، ادبی یا انشائی حیثیت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اتنی اہمیت کہ اگر مطالب کے اعتبار سے کتاب بالکل غیر معتبر ٹھہرتی تو بھی انشا پردازی کے لحاظ سے اُس کا شمار اُردو کی بہترین کتابوں میں ہوتا۔ اُردو ادب اگر آب حیات کے مقابلے میں کوئی چیز پیش کر سکتا ہے تو وہ حضرت آزاد ہی کی دوسری تصنیفیں ہیں۔ یعنی قصص الہند، دربار اکبری، نیرنگ خیال سخندان فارس۔ آزاد کی انشا پردازی ایک طولانی بحث چاہتی ہے۔ اور اس وقت وہ بحث چھیڑنا منظور نہیں، صرف اتنا کہدوں کہ آزاد کا دماغ جو کچھ سوچتا ہے اور اُن کا دل جو کچھ محسوس کرتا ہے، اُن کا قلم پوری قوت اختصار، حسن اور اثر کے ساتھ ان دونوں چیزوں کی ترجانی

---

[۱] دربار اکبری صفحہ ۲۲۴

بہ یک وقت کرتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے لیے آبحیات کے 'خاتمے' کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔ یہ عبارت جتنی طویل ہے اُس سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا ہے کہ اُردو کے قدیم غزل گو شاعروں نے زبان اور شاعری کی کیا خدمت کی ہے، اُن کے کلام کے عارضی اور دائمی عناصر کیا ہیں اور اُردو کی جدید بالقصد شاعری میں اُس سے کیا مدد مل سکتی ہے، یا یوں کہیے کہ اُن کے کلام کی قدر و قیمت پہلے کیا تھی، اب کیا ہے اور آئندہ کیا ہوگی اور یہ سب کچھ اس طرح کہا ہے کہ مصنف کو اُردو شاعری کے ان معماروں سے جو لا انتہا محبت اور عقیدت تھی وہ لفظ لفظ سے جھلک رہی ہے اور ہماری رگ رگ میں سمائی جاتی ہے۔

آبحیات کا خاتمہ

"پانچواں دور بھی ہو چکا۔ مگر سب سوگوار بیٹھے ہیں کہ دور نہیں ہو چکا۔ ہندوستان کی پرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری ہو چکی اور اس کی ترقی

کا چشمہ بند ہوا۔ اہل مشاعرہ نوحہ خوانی کر رہے ہیں کہ اے صدر نشینو! تم چلے اور حسن و عشق کے چرچے اپنے ساتھ لے چلے۔ کیونکہ متاعِ عشق کے بازار تھے تو تمھارے دم سے تھے، نگار حسن کے سنگار تھے تو تمھارے قلم سے، تم ہی قیس و کوہکن کے نام لینے والے تھے، اور تم ہی لیلیٰ و مجنوں کے جوبن کو جلوہ دینے والے۔ لیکن اجسام فانی کی پرستش کرنے والے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم گئے اور مشاعرے ہو چکے۔ نہیں نہیں۔ تمھاری تصنیفیں، تالیفیں، حکایتیں اور روائتیں جب تک موجود ہیں، تم آپ موجود ہو۔ تمھارے فخر کی دستاریں ایسے تحسین و آفرین کے پھولوں سے تاجدار ہیں جو ہمیشہ لہلہاتے رہیں گے اور گلے ہیں اُن سدا بہار پھولوں کے ہار ہیں، جن تک کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہنچے گا۔

حیاتِ دوام کا خدائی چشمہ جاری ہے۔

جس کے کنارے پر عہد بعہد پانچوں جلسے
جمے ہوئے ہیں۔ آبحیات کا دور چل رہا ہے
چشمے کا پانی زمانے کے گزرنے کی تصویر کھینچتا
ہے اور موجیں ظاہری زندگی کو الوداع
کہتی چلی جاتی ہیں۔ تمھارے جلسے اپنے اپنے
عہد کی حالت خاموشی کی بولی میں بیان
کر رہے ہیں۔ تمھارے مقالات و حالات اُس
زمانے کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں
ہیں۔ گویا بے زباں مورتیں منہ سے بول رہی ہیں،
خیالی صورتیں اپنی چال ڈھال ایسی بے تکلف
دکھا رہی ہیں کہ کوئی زندہ انسان اس طرح
کھُلے دل سے کام نہیں کرتا۔ تمھاری زندگی عجب
لطف کی زندگی ہے۔ کوئی بُرا کہے تمھیں رنج نہیں
اچھا کہے تو خوشی نہیں۔ تمھیں کوئی آزار نہیں
دے سکتا۔ تم سے کسی کو رنج نہیں پہنچ سکتا
اللہ اللہ امن و امان کی دنیا کے لوگ ہو کہ چُپ
چاپ آرام کے عالم میں نچنت گزران کرتے ہو۔

تم میں آواز نہیں مگر رنگا رنگ کی بولیاں بول رہے ہو۔ تم وہ ہو کہ نہیں ہو، مگر ہو۔ مر گئے ہو۔ پھر بھی زندہ ہو۔ اے کاغذی خانقاہوں کے بسنے والو! تمھاری تصنیفات تمھارے آباد گھر ہیں۔ جب آنکھیں کھولتا ہوں تم نقش و حروف کے لباس پہنے ہنستے بولتے، پھرتے چلتے نظر آتے ہو۔ اور ویسے ہی نظر آتے ہو جیسے کہ تھے۔ زمانہ سالہا سال کی مسافت دور نکل آیا اور سیکڑوں برس آگے بڑھا اور بڑھ جائے گا مگر تم اپنی جگہ بدستور قائم ہو۔ تمھارے اعمال و افعال کے پتلے تمھاری تصنیفیں ہیں۔ اُن کی زبانی آئندہ نسلوں سے اپنے دل کی باتیں کہتے رہو گے۔ نصیحتیں کرو گے، سمجھاتے رہو گے، غمگین دلوں کو بہلاؤ گے، مردہ طبیعتوں میں جان ڈالو گے، مدھم آرزوؤں کو چمکاؤ گے، سوتے دلوں میں گدگدی کرو گے، خوشی کو اُداسی کر دو گے، اُداسی کو خوشی کر دو گے۔

"اے با اقبال گداؤ! اے شاہ نشان خاکسارو! تمھاری نیک نیتی اچھے وقت تمھیں لائی۔ مگر افسوس کہ تمھاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمھیں اچھے سامان اور اچھے قدر دان دیے۔ جن کی بدولت جوہر طبعی اور جوش اصلی کو اپنے اور اپنے شوق کے پورا کرنے کے سامان ملے۔ اب نہ وہ سامان ہوں گے، نہ ویسے قدر دان ہوں گے نہ کوئی اُس شاخ کو ہرا رکھ سکے گا، نہ تم سے بڑھ کر اُس میں پھل پھول لگا سکے گا۔ ہاں تمھاری لکیروں کے فقیر تمھارے ہی ہجر وصل اور خط و خال کے مضمون لیں گے، ان ہی لفظوں کو اُلٹیں پلٹیں گے، اور تمھارے چبائے ہوئے نوالوں کو منھ میں پھراتے رہیں گے۔

تم نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے ایسے عالی شان محل تعمیر کیے ہیں کہ صدہا سال کی مسافت سے دکھائی دیتے رہیں گے: وہ فلک

کے صدموں اور انقلاب کے طوفانوں کو خاطر
میں نہیں لاتے اور زمانے کے زلزلوں کو ہنس کر
کہتے ہیں کہ بھلا آؤ تو سہی!

"اگرچہ زیادہ تر عمارتیں تمھارے حسن و
عشق کے جلوس کے لیے ہیں، مگر اُن میں بھی
تم نے ایسے سامان اور مصالح لگا دیے ہیں،
کہ آئندہ نسلیں جس غرض سے چاہیں گی عمارتیں
بنائیں گی اور تمھاری صنعتوں سے بہت کچھ
مدد پائیں گی۔ جن پتھروں کو تم نے منبّت اور
گلکاری سے تراش کر فقط خوشنمائی کے لیے لگایا
تھا۔ ہم انھیں وہاں سے نکال لیں گے، شکریہ
کے ساتھ آنکھوں سے لگائیں گے اور اُن سے
کسی ایسی محراب کو زینت دیں گے۔ جو اپنی
مضبوطی سے ایک ایک ملکی ایوان کو استحکام
دے، اور دلوں کو خوشنمائی سے شگفتہ کرے۔
کیونکہ تمھارے لفظوں کی عمدہ تراشیں اور
اُن کی پسندیدہ ترکیبیں، استعارے اور تشبیہیں

اگرچہ عاشقانہ مضامین میں ہیں، پھر بھی اگر ہم
سلیقہ اور امتیاز سے کام میں لائیں گے تو علوم
فنون، تاریخ وغیرہ عام مطالب میں ہمارے
ادائے مقاصد اور انداز بیان کے لیے عمدہ
معادن اور کارآمد ہوں گے۔ اے ہمارے رہنماؤ!
تم کیسے مبارک قدموں سے چلے تھے اور کیسے
برکت والے ہاتھوں سے رستے میں چراغ رکھتے
گئے تھے، کہ جہاں تک زمانہ آگے بڑھتا ہے
تمھارے چراغوں سے چراغ جلتے چلے جاتے
ہیں اور جہاں تک ہم آگے جاتے ہیں تمھاری
ہی روشنی میں جاتے ہیں۔ ذرا ان برکت والے
قدموں کو آگے بڑھاؤ کہ میں آنکھوں سے
لگاؤں۔ اپنا مبارک ہاتھ میرے سر پر رکھو
اور میرے سلام کا تحفہ قبول کرو۔[۱]''

آزاد کی عبارت ہے کہ لفظوں کا ایک گلزار ہے جس میں معنی کی

۱؎ آبحیات صفحہ ۵۵۰-۵۵۲

بہار آئی ہوئی ہے۔

آزاد کی کامیابی آب حیات جس مقصد سے تصنیف کی گئی تھی وہ مصنف کے اس قول سے ظاہر ہے۔

"خیالات مذکورۂ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ۔ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں، یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں، انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھ دوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں آن کھڑی ہوں اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو[۱]۔"

حضرت آزاد کو اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل ہوئی جو بہت کم مصنفوں کو میسر ہوئی ہوگی۔ آب حیات کی تکمیل کے بعد حضرت آزاد نے خدا کی درگاہ میں یہ دعا کی تھی کہ "بزرگوں کے ناموں اور کلاموں کی برکت

---

[۱] آبحیات ص۲-۵

سے مجھے اور میرے کلام کو بھی قبول عام اور بقائے دوام نصیب ہو[۱]۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ آزاد کی یہ دعا قبول ہوئی۔ آب حیات نے جہاں ہمارے ممتاز شاعروں کو حیات جاودانی بخشی ہے، وہاں اپنے مصنف کو بھی زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

---

[۱] آبحیات ص۵
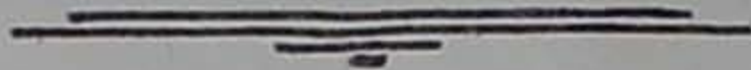
پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی کی

دوسری کتابیں

ہماری شاعری - پانچواں اڈیشن (راجہ رام کمار پریس)

اُردو زبان اور اس کا رسم خط ... (دانش محل)

ترتیب :-

فیض میر

مجالس رنگیں

نظام اُردو

جواہر سخن .. جلد دوم ...... (ہندوستانی اکاڈمی)

فرہنگ امثال .... (رام دیال)

روح انیس .... (انڈین پریس)

دیوان فائز .... (انجمن ترقی اردو)

شاہکار انیس .... (نظامی پریس)

متفرقات غالب دارالاشاعت رامپور)

ترجمہ :-

امتحان وفا

ضمیمہ

ناسخ کے بارے میں آزاد کے بعض بیانوں کی تصدیق

آزاد نے شیخ ناسخ کی تصنیفوں کے سلسلے میں لکھا ہے "دیوان تین ہیں مگر دو مشہور ہوئے" لیکن کلیاتِ ناسخ کے مطبوعہ نسخوں میں صرف دو دیوان نظر آتے ہیں اس لئے بعض لوگوں کو آزاد کا یہ قول قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ناسخ کے مطبوعہ کلیات میں جس کو ہم اُن کا فقط دوسرا دیوان سمجھتے ہیں وہ دوسرے اور تیسرے دیوانوں کا مجموعہ ہے۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ کلیاتِ ناسخ کا پہلا ایڈیشن جو میر حسن رضوی مالک مطبع حسنی کی فرمائش اور حاجی محمد حسین کے اہتمام سے مطبع محمدی، لکھنؤ میں شیخ ناسخ کے انتقال کے صرف چار سال بعد ۱۲۵۸ھ میں چھپا تھا اُس کی "عبارتِ خاتمہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن رضوی رئیس محلہ محمود نگر (لکھنؤ) ولد میر حسین عرف میر کامل کے دل میں پہلے پہل یہ خیال پیدا ہوا کہ ناسخ کا کلیات چھاپنا چاہیے۔ چنانچہ اُن کی فرمائش سے یہ کلیات یوں مرتب کیا گیا کہ پہلا دیوان متن میں، دوسرا دیوان حاشیے پر، اور تیسرا دیوان بھی حاشیے پر دوسرے دیوان کی ہر ردیف کے ضمیمے کے طور پر، اور مثنوی، رباعیاں، اور تاریخیں بھی متن میں اور بعض تاریخیں اور رباعیاں حاشیے پر درج کی گئیں۔ اس مقام کی اصل فارسی عبارت یہ ہے:

> "دیوان اول مسمّٰی بہ دیوان ناسخ در متن، و دیوان دوم مسمّٰی بہ دفتر پریشان بر حاشیہ، و دیوان سوم مسمّٰی بہ دفتر شعر بر حاشیہ در ہر ردیف بہ ضمیمۂ دفتر پریشان، و مثنوی و رباعیات و تاریخہا نیز در متن، و بعضے از تاریخہا و رباعیات بر حاشیہ۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ کلیات ناسخ کے اس ایڈیشن میں تیسرے دیوان کی ہر ردیف کی غزلیں دوسرے دیوان کی اُسی ردیف کی غزلوں میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اسطرح جو ناسخ کا

صرف دوسرا دیوان معلوم ہوتا ہے وہ حقیقت میں اُن کے دوسرے اور تیسرے دیوانوں کا مجموعہ ہے۔
کلیاتِ ناسخ کے اسی ایڈیشن میں "عبارتِ خاتمہ" سے کچھ پہلے ایک اور فارسی عبارت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے دیوان کا تاریخی نام ناسخ کے شاگرد میاں غنی نے دیوانِ ناسخ رکھا جسکے عدد زبر و بینات کے قاعدے سے بارہ سو بتیس (۱۲۳۲) نکلتے ہیں اور یہی اس دیوان کی تالیف کا ہجری سال ہے۔ دوسرے دیوان کا تاریخی نام خود مصنف نے دفترِ پریشان رکھا، اسلئے کہ وہ الٰہ آباد کی آمد و رفت کی پریشانی کے زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ اِس نام سے اُس کا سال تالیف ۱۲۴۷ھ نکلتا ہے۔ تیسرے دیوان کا تاریخی نام ناسخ کے شاگرد رشید رشک نے دفترِ شعر رکھا جس کے عدد بارہ سو چون ۱۲۵۴ نکلتے ہیں۔ ناسخ کا انتقال ۱۲۵۴ھ میں ہوا۔ اسلئے قرینِ قیاس ہے کہ اُن کا تیسرا دیوان اُن کے سامنے مرتب نہیں ہوا۔

اُس زمانے میں کسی دیوان کی تکمیل کیلئے یہ ایک ضروری شرط تھی کہ اُس میں ہر حرف کی ردیف میں غزلیں موجود ہوں۔ غالباً ناسخ کی غزلوں کا یہ آخری مجموعہ اس اعتبار سے مکمل دیوان نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اور شاید یہی سبب تھا کہ اس مجموعے کو علیحدہ مستقل دیوان کی صورت میں شائع کرنا مناسب نہ معلوم ہوا اور جن ردیفوں کی غزلیں اُس میں موجود تھیں وہ دوسرے دیوان کی اُنھیں ردیفوں میں شامل کر دی گئیں۔

کلیاتِ ناسخ کے اس پہلے ایڈیشن کی کتابت عبدالحیٔ ولد مولوی عبدالستار سندیلوی نے کی تھی جو مشہور خوشنویس حافظ نور اللہ کے شاگرد تھے اور اس کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ پھر بھی اس میں طباعت کی اتنی غلطیاں رہ گئیں کہ میر علی اوسط رشک کو سات صفحے کا طولانی غلط نامہ چھپوا کر آخر میں لگانا پڑا۔

کلیاتِ ناسخ کا دوسرا ایڈیشن شہزادہ مرزا فرخندہ بخت بہادر کی فرمائش اور داروغہ مومن علی کے اہتمام سے مطبع مولائی میں ۱۲۶۲ھ میں چھپا۔ یہ مطبع لکھنؤ میں راجہ ٹکیت رائے کی بازار میں واقع تھا۔ اُس میں وہی پہلے ایڈیشن والی ترتیب قائم رکھی گئی۔ اُس کے

خاتمے پر یہ عبارت ملتی ہے :-

"دیوانِ اوّل مسمّیٰ بہ دیوان ناسخ در متن، و دیوانِ دوم مسمّیٰ بہ دفترِ پریشاں بر حاشیہ، و دیوانِ سوم مسمّیٰ بہ دفترِ شعر در ہر ردیف ملحق بہ دفترِ پریشاں"

یہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کی صفحہ بہ صفحہ نقل ہے۔ ان دونوں ایڈیشنوں کے دو دو نسخے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ بعد کو یہ کلیات متعدد مرتبہ مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا، مگر غزلوں کی ترتیب میں کوئی تغیر نہیں گیا۔ اس لئے اُس میں بھی بظاہر ناسخ کے دو دیوان، لیکن درحقیقت تینوں دیوان شامل ہیں۔

دیوان ناسخ کے چار قلمی نسخے بھی میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اُن میں تین نسخے پہلے دیوان کے اور ایک دوسرے دیوان کا ہے۔ اگر ناسخ کے دوسرے دیوان کے قلمی نسخے کا اُن کے مطبوعہ دیوانِ دوم سے مقابلہ کیا جائے اور مطبوعہ دیوان سے وہ غزلیں نکال لی جائیں جو قلمی نسخے میں نہیں ہیں تو اُن غزلوں کے مجموعے سے ناسخ کا تیسرا دیوان بن جائے گا۔

آزاد نے لکھا ہے کہ ناسخ کو معتمد الدولہ آغا میر نے ایک قصیدے کے صلے میں سوا لاکھ روپیہ دیا۔ بعض لوگوں کو اس بیان کی صحت میں شبہ ہے، کیونکہ ان کے خیال میں ناسخ نے کوئی قصیدہ کہا ہی نہیں۔ مگر میرے کتب خانے کے قلمی نسخوں میں کئی فارسی قصیدے اور قطعے اور متعدد اردو غزلیں اور مثنویاں وغیرہ ایسی موجود ہیں جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہیں۔ ایک نسخے کے آخر میں نواب معتمد الدولہ (آغا میر) کی مدح میں ناسخ کا ایک فارسی قصیدہ درج ہے۔ یہ ترسٹھ شعر کا قصیدہ صنعت توشیح میں ہے۔ اس کے ہر مصرعے کا پہلا حرف لے لینے سے اُس کے عنوان کی عبارت بن جاتی ہے، جو حسبِ ذیل ہے :-

"مدار المہام عمدۃ الامرا فرزند ارجمند یار وفادار سپہ سالار نواب معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ فدوی شاہِ زمن بادشاہ غازی خلّد اللہ ملکہٗ"

آزاد نے غالباً اسی قصیدے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک دوسرے قلمی نسخے میں آغا میر کی مدح میں ناسخ کے دو فارسی قصیدے اور بھی ہیں۔ ایک کی ردیف 'معتمد الدولہ بہادر' اور دوسرے کی 'ضیغم جنگ' ہے۔ مگر مذکورۂ بالا قصیدہ ان دونوں قصیدوں سے بہت بڑا ہے اور اس میں صنعت توشیح کی دقّت طلب قید بھی لگائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس قصیدے میں وزیر کی مدح کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی مدح کا التزام کیا گیا ہے۔ آغا میر نے جو اس قصیدے کا اتنا گراں قدر صلہ دیا تو اس میں اُستاد نوازی کے جذبے کے علاوہ بادشاہ کی مدح کا احترام اور اُس کی نظر میں سُرخ روئی حاصل کرنے کا مقصد بھی مد نظر رکھا ہوگا۔ اس قصیدے کے ابتدائی چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن کے ہر مصرعے کا پہلا حرف لینے سے قصیدے کے عنوان کا پہلا لفظ 'مدار المہام' بن جاتا ہے:۔

مدیح زبدۂ اولادِ حیدرِ کرار — دلا وسیلۂ خیر و صلاح خود پندار

اگر اطاعتِ حکم مودتِ قرباست — رہِ نجات زاغوائے این و آں مگزار

ازیں عمل عملے نیست خوبتر کہ خدا — لب و دہان و زبان داد بہرایں گفتار

مرا گلے ست بہارِ حدیقۂ عالم — ہزار بار بگویم بباغ پیش ہزار

ازآں گل است ہمہ قبض و بسطِ غنچۂ گل — معطر است ببوئیش مشام ہر گلزار

آزاد نے ناسخ کے متعلق لکھا ہے کہ "شیخ صاحب کا مذہب پہلے سنت وجماعت تھا، پھر مذہب شیعہ اختیار کیا۔" ان کے اس قول کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ لکھنؤ کے مضافات میں گومتی ندی کے کنارے گئو گھاٹ کے پاس ایک ٹیلے پر ایک صوفی

بزرگ شاہ نصرت اللہ خلوتی کا روضہ خانقاہ، اور مسجد بنی ہوئی ہے۔ شاہ صاحب کے موجود سجادہ نشین شاہ عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے کہ یہ تینوں عمارتیں اکبر بادشاہ کے عہد میں خود بادشاہ کے حکم سے بنوائی گئی تھیں۔ اکبر نے ان عمارتوں کی نگہداشت اور عرس وغیرہ کے مصارف کے لئے سات گاؤں کی معافی عطا کی تھی مگر اب صرف ایک گاؤں باقی رہ گیا ہے، جس میں یہ روضہ واقع ہے اور جو اسی سبب سے "روضہ گاؤں" کہلاتا ہے۔ راقم نے اِس گاؤں میں جاکر اس روضے کو دیکھا جس بلند آراضی پر یہ واقع ہے اُس کا رقبہ کبھی بہت وسیع ہوگا مگر اب لوگوں نے کھود کھود کر اور برسات کے پانی نے کاٹ کاٹ کر اُسے بہت چھوٹا کر دیا ہے۔ یہ قطعۂ آراضی اہل سنت کا قبرستان بن گیا تھا۔ اُس میں متعدد پختہ قبریں اب بھی موجود ہیں۔ اُنھیں میں ناسخ کے والدین کی قبریں بھی ہیں۔ اُن کے سرہانے کے طاقوں میں پتھر پر تاریخ کا ایک ایک مصرعہ کندہ ہے اور مصرعے سے جو تاریخ نکلتی ہے وہ بھی اُس کے نیچے درج ہے۔ وہ مصرعے حسب ذیل ہیں:

"بیکر اطہر اُمّ ناسخ" ــــــ "گور پدر جلیل ناسخ"

یہ مصرعے بتاتے ہیں کہ ناسخ کی والدہ کا انتقال ۱۱۹۹ھ میں اور والد کا ۱۲۱۶ھ میں ہوا۔ ناسخ کے والدین کا اہل سنت کے قبرستان میں دفن ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ مذہباً اہل سنت تھے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ناسخ بھی ابتدائی عمر میں سُنّی تھے لیکن اُن کے کلام سے، بالخصوص اُن کی مثنویوں سے اُن کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ بعد کو انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کرکے مذہبِ شیعہ اختیار کرلیا تھا۔

آبحیات میں ناسخ کی ایک مثنوی کا نام نظم سراج ملتا ہے۔ معلوم نہیں

کہ یہ مصنف کا سہو قلم ہے یا کاتب کی اصلاح۔ بہر حال اس کا صحیح نام سراج نظم ہے۔ اس کے دو ثبوت ہیں۔ اول یہ کہ نظمِ سراج ایک بے معنی ترکیب ہے اور "سراج نظم" کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرا یہ کہ میرے کتب خانے میں اس مثنوی کا ۱۲۶۵ھ کا چھپا ہوا جو نسخہ ہے اس کے سرِ ورق کی منظوم عبارت میں "نظم سراج" ناموزوں اور "سراجِ نظم" موزوں ہوتا ہے۔ وہ منظوم عبارت حسب ذیل ہے:

یُمنِ فیضِ خدائے سبحاں سے	عونِ خلّاقِ جن و انساں سے
مثنویِ جنابِ کاملِ فن	ناسخ اوستاد اہلِ سخن
نُور پھیلا ہے جس کے مضموں کا	نام جس کا سراجِ نظم ہوا
نظم ہے ترجمہ حدیثوں کا	یعنی جو کچھ امام دیں نے کہا
باتیں اُس کی جو ہیں بہت مطبوع	کی محمد حسین نے مطبوع
نافعِ خلق بے گماں ہے یہ	سخن حق ہی کا بیاں ہے یہ

غلط نامہ

کتابت کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو چھوڑ کر صرف ان غلطیون کی تصحیح کی جاتی ہے جن سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷	۵	شروانی	شیرانی	۲۵	۸	بھاشا	بھاکے
۱۲	۱۱	کمالوں	باکمالوں	۲۶	۱	کے	کہ
۱۴	۱۵	بتائے	بتائے ہوئے	؍؍	۶	بھاشا	بھاکا
۱۵	۲	بھی	بہت	؍؍	۱۲	اسی	اُس
؍؍	۱۴	دانوں	والوں	؍؍	؍؍	یہ اسلوب	بہ اسلوب
۱۶	۴	مزا	مزہ	؍؍	۱۴	محاورۂ	محاورہ
۱۸	۱۰	اُس	اُسی	۲۷	۲	میں	نہیں
۱۹	۱۶	مجھے	بجھے	؍؍	۳	میں	نہیں
۲۰	۹	کے	کا	۳۰	۱۰	خرمودند	فرمودند
؍؍	۱۳	ان	احسان	۴۲	۶	تذکرہ	یہ تذکرہ
۲۴	۳	دکھنی یا	دکھنی اور	۴۳	۱۳	اپنا منھ	منہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۸	۱۲	زبانتش	زبانش	۷۲	۱۳	تذکرۂ قاسم	قاسم
۵۰	۶	سخش	سخنش	۷۶	۶	کش	کشید
۵۱	۸	زحمتہ	رحمتہ	؍؍	۹	کہیں	کسی
؍؍	۹	جان جاناں	جان جاں	۸۰	۱۶	اردو	اردو کو
؍؍	۱۰	جان جاں	جان جاناں	۸۳	۷	بالقصد	باقصد
۵۴	۷	پدری	پدرمی	۸۴	۱۲	نخر	فخر
؍؍	۱۱	کہ	کی	۸۵	۱۴	کہ	کوئی
؍؍	۱۲	کہ	کہ یہ	۸۷	۱۳	چبائے	چبائے ہوئے
۶۲	۱	اخلاق	اغلاق				

اضافے

ص۸ آخری سطر کے بعد

۳۴۔ سفینۂ ہندی۔ از رائے بھگوان داس ہندی۔ قلمی۔ کتب خانہ مشرقی، پٹنہ

ص۳۲ آخری سطر کے بعد

رائے بھگوان داس ہندی

”عاشق پیشہ بود و ہموارہ در سرش سودائے پری رخاں جا داشت۔“ (سفینۂ ہندی۔ قلمی)

ص۵۲ پہلی سطر کے بعد

رائے بھگوان داس ہندی اپنے تذکرے سفینۂ ہندی میں لکھتے ہیں ”والدش میرزا جان نام داشت نظر براں پسر را جان جان نام نہادہ بود، بہ جان جاناں شہرت یافت۔“